

انشا اور تلفظ

رشید حسن خاں

مکتبہ جامعہ ملیہ

اشتراک

پیشہ کی نیابت کے فروع اور زبانیں

انشا اور تلفظ

رشید حسن خاں

مکتبہ جامعہ ملیہ

اشتراک

پیشہ کی نیابت کے فروع اور زبانیں

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لکھنؤ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، تا مبادہ حالات سے بھی ساقط نہ ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلباء کے لیے ”درسی کتب“ اور ”معیاری سیریز“ کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ قحط پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کیا اب ملکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دنی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناک کو کھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ پورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جٹک (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعال ڈائریکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لکھنؤ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عمل اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شامل حال رہے گا۔

خالد محمود

چیئرمین ڈائریکٹرز، مکتبہ جامعہ لکھنؤ

Insha Aur Talaffuz

by

Rasheed Hasan Khan

Rs.45/-



صدر دفتر

☎ 011-26987295

مکتبہ جامعہ لکھنؤ، جامعہ گھرنی، دہلی-110025

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لکھنؤ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-110006

☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لکھنؤ، پرنسپل بیلڈنگ، ممبئی-400003

☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لکھنؤ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ-202002

☎ 011-26987295

مکتبہ جامعہ لکھنؤ، پھولپال گراؤنڈ، جامعہ گھرنی، دہلی-110025

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

قیمت: 45/- روپے

تعداد: 1100

مراعات: 2011

سلسلہ مطبوعات: 1445

ISBN: 978-81-7587-539-5

بشر: ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون-33/9، PC، انسٹی ٹیوٹل ایریا، منو، نئی دہلی-110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urduncouncil.nic.in

طابع: ہے۔ کے۔ آفیسٹ پرنٹرز، بازار نیما، جامع مسجد-110006

اس کتاب کی چھاپائی میں GSM TNPL Maplitho 70 کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

حرفِ آغاز

املا پر تو پچھلے پندرہ بیس سال میں بہت سا کام ہوا ہے، مگر انشا پر اگر کچھ لکھا گیا ہے، تو اُسے نہ ہونے کے برابر کہا جاسکتا ہے۔ ایک مشکل یہ ہے کہ اردو کے طالب علموں کے لیے ایسے ضروری موضوعات پر کچھ پڑھنے کی گنجائش کم سے کم ہوتی جاتی ہے۔ اس سے بھی بڑی مشکل یہ ہے کہ اساتذہ کی توجہ بھی اس طرف گویا مبذول نہیں ہوتی۔ اس میں حالات کے جبر کا حصہ اتنا نہیں جتنا دخل ہماری بے اعتنائی کو ہے۔ طالب علم مجبور سہی، استاد اُس قدر مجبور نہیں ہوتا۔ وہ اگر املا اور انشا کے ضروری اجزاء کو اپنی طرح جانتا ہو، تو اپنے طلبہ کو بہ قدر ضرورت بتا سکتا ہے۔ یہ امکان ہمیشہ رہے گا کہ بہت سے طالب علموں میں سے چار چھ، یا دس بارہ ایسے طالب علم نکل آئیں جو ان موضوعات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس طرح زبان کے متعلقات کا شعور پیدا ہوتا رہے اور سلسلہ پوری طرح ٹوٹنے نہ پائے۔

لفظ کس طرح لکھا جائے، یہ املا کا مسئلہ ہے۔ جملہ کس طرح لکھا جائے، یہ انشا کا مسئلہ ہے۔ عبارت کی خوبیوں اور خامیوں کا تعلق بھی انشا سے ہوتا ہے۔ یوں انشا کی اہمیت کچھ کم نہیں۔ اساتذہ اگر ان مسائل کو اپنی طرح جانتے ہوں تو پھر وہ مختلف موقعوں پر بعض نہایت ضروری باتوں کو اپنے طلبہ تک پہنچا سکتے ہیں۔

انشا وسیع موضوع ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں اس سے متعلق ساری معلومات کو یک جا کر دینا مقصود نہیں، اسی لیے ضروری باتوں کو اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

رشید حسن خاں

سکار ہال۔ دہلی یونیورسٹی، دہلی

مرزا ادیب کے نام

جن کا نام بچوں کے ادیب کی حیثیت سے بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

رشید حسن خاں

۱۶ دسمبر ۱۹۹۲ء

انشا

جملہ، لفظوں سے بتا ہے۔ جملوں سے عبارت بنتی ہے۔ اچھی عبارت کے لیے ضروری ہے کہ جملے بے عیب ہوں۔ بے عیب جملے ہم اس وقت لکھ سکتے ہیں جب لفظوں کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ اچھی طرح جاننے کا مطلب یہ ہے کہ تین باتیں ضرور معلوم ہوں: ۱۱، لفظ کا صحیح اطلاق کیا ہے۔ (۲) اس کے معنی کیا ہیں۔ (۳) جملے میں اس لفظ کو کس طرح لانا چاہیے۔ اس تیسری بات میں قواعد، روزمرہ، محاورہ؛ یہ سب شامل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قواعد کی غلطی نہ ہو، اسی کے ساتھ ساتھ روزمرہ اور محاورہ بھی درست ہو۔ ذرا دیر کے لیے مان لیجیے کہ آپ نے یہ جملہ لکھا: اس دفعہ ان کو سونے کا تمغہ ملا ہے۔ اس میں قواعد کے لحاظ سے کوئی عیب نہیں، اس کے باوجود یہ جملہ بے عیب نہیں۔ خرابی یہ ہے کہ ایک لفظ کا اطلاق ٹھیک نہیں۔ اصل لفظ ”تمغہ“ ہے۔ اطلاق اس ایک غلطی نے پورے جملے کو بگاڑ دیا۔

میں نے ایک بار ایک جملہ اس طرح لکھا تھا: سب عورتیں وہاں بیٹھیں، عورتیں تھیں۔ میرے استاد محترم نے سمجھایا تھا کہ اس جملے میں فعل صحیح صورت میں نہیں آیا۔ یوں لکھنا چاہیے تھا: سب عورتیں وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ قواعد کی غلطی ہوئی۔

ہمارے ایک مشہور شاعر کا مصرع تھا: ”گٹھ میں چشم عنایت ادھر نہ فرماں“۔ مشہور نقاد نیاز فتح پوری نے اس پر یہ اعتراض کیا تھا کہ ”عنایت فرمانا، محاورہ ہے، چشم عنایت فرمانا، محاورہ نہیں۔“ اس طرح معلوم ہوا کہ جملہ ہوا مصرع، اس میں محاورے کو اصلی شکل میں آنا چاہیے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ محاوروں میں نہ تو کسی لفظ کو بدل سکتے ہیں، نہ کوئی لفظ کم کر سکتے ہیں، نہ بڑھا سکتے ہیں۔ شاعر نے اصل محاورے ”عنایت فرمانا، میں ایک لفظ ”چشم“ بڑھا دیا اور بات بگڑ گئی۔ اس مصرعے میں یہ زبان کا عیب ہوا۔

ایک پرانی بات یاد آگئی۔ بے تکلف دوستوں کی محفل جمی ہوئی تھی، ایک صاحب نے کہا: باہر زور کی بارش پڑ رہی ہے۔ دوسرے صاحب نے تائید کی: ہاں بھائی، بہت زور کی بارش گر رہی ہے۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: بارش پڑنا اور بارش گرنے، دونوں روزمرہ کے خلاف ہیں۔ ”بارش ہونا“ اور ”پانی برسنا“ کہتے ہیں۔ وہ دونوں حضرات بھری محفل میں شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

روزمرہ کی تعریف تو آپ جانتے ہوں گے۔ اس کا مطلب ہے: اس طرح لکھنا یا بولنا، جس طرح معیاری اردو میں بولتے اور لکھتے آئے ہیں۔ مثلاً کوئی صاحب کہیں: ”آب پی لو“، تو کہا جائے گا کہ اردو والے اس طرح نہیں بولتے۔ ”پانی پی لو“ کہتے ہیں۔ ”آب“ کے معنی ہیں: پانی۔ لفظ اپنی جگہ ٹھیک ہے، یا معنی ہے، دوسرے مقامات پر استعمال میں بھی آتا ہے؛ لیکن ”پینے“ کے ساتھ ”پانی“ کا لفظ آتا ہے۔

یا جیسے یہ کہا جائے کہ ”ان کا تو پانی دانہ اٹھ گیا ہے“ اس پر بھی کہا جائے گا یہ روزمرہ کے خلاف ہے۔ روزمرہ کے لحاظ سے ”دانہ پانی“، کہنا چاہیے تھا، یعنی: ان کا تو دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔ یا جیسے کوئی صاحب کہیں: ”آپ وہاں جاؤ“ کہا جائے گا کہ یہ مناسب انداز بیان نہیں ہے آپ وہاں جائیے اور ”تم وہاں جاؤ“ کہتے ہیں۔ اردو کے مشہور شاعر فیض احمد فیض کی غزل کا

ایک شعر ہے :

خیر! ہیں اہل ذہیر جیسے ہیں آپ اہل حرم کی بات کرو
دوسرے مصرعے پر یہی اعتراض کیا گیا ہے کہ ”آپ بات کرو“ صحیح انداز بیان
نہیں ہے آپ بات کیجیے، کہنا چاہیے، یا ”تم بات کرو“ کہہ سکتے ہیں۔
اب ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ بے عیب شعر پر وہ ہے جس میں روز مرہ
اور محاورے کی غلطی نہ ہو، قواعد کی غلطی نہ ہو اور املا کی بھی غلطی نہ ہو۔
یہ ٹھیک ہے کہ بے عیب عبارت کھنا اچھی بات ہے، لیکن یہی سب کچھ نہیں
اچھی عبارت وہ ہے جو بے عیب بھی ہو اور اس میں بیان کا حسن بھی ہو۔
ایک ہی بات کو کئی طرح کہا جاسکتا ہے، ذہین طالب علم اس بات کو جلد
ہی سمجھ لیتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ اچھے سے اچھے انداز بیان کو
اپنائیں۔ اس طرف توجہ کرنے سے اور شوق سے اچھی نشر لکھنے کا سلیقہ آتا
ہے۔ مولانا حالی کا یہ مصرع ہمیشہ نظر کے سامنے رہنا چاہیے :

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

اچھی نشر لکھنے کا کوئی مقررہ قاعدہ نہیں۔ سوچنے سمجھنے سے یہ بات اپنے
آپ ذہن پر روشن ہونے لگتی ہے۔ کبھی ایسا سمجھیے کہ ایک ہی جملے کو دو تین
طرح لکھ کر دیکھیے۔ ایک دو بار لفظوں کی ترتیب بدل دیجیے، ایک دو لفظوں
کو نکال دیجیے، یا ایک دو لفظوں کو بدل کر دیجیے۔ آپ کو محسوس ہونے
لگے گا کہ ایک ہی جملے کی ان کئی شکلوں میں سے کوئی ایک صورت ایسی بھی ہے
جو دوسری صورتوں سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

جملے میں جو لفظ لائے جائیں، تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ مطلب
کو اچھی طرح ادا کر رہے ہیں؟ ایسا تو نہیں کہ ایک یا دو لفظ بدل دیے جائیں
تو پہلے کے مقابلے میں مفہوم بہتر طور پر ادا ہو سکے گا۔ گویا اچھا جملہ لکھنے کے
لیے مناسب لفظوں کا انتخاب پہلی ضروری بات ہے۔ دوسری ضروری بات
یہ ہے کہ جن مناسب لفظوں کو منتخب کیا جائے، جملے میں ان کی ترتیب بھی
مناسب طور پر ہو نا چاہیے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ کسی جملے میں کسی

ایک لفظ کو ادھر ادھر کر دینے سے بیان کا حسن بڑھ جاتا ہے، اور کبھی
مفہوم کو ادا کرنے کی بہتر صورت سامنے آ جاتی ہے۔

یہ بات بھی دیکھنے کی ہوتی ہے کہ وہ جملہ جب زبان سے ادا ہوگا تو اس میں
روانی کتنی ہوگی۔ کوئی ایسا لفظ تو نہیں آگیا ہے جس کو ادا کرنے میں زبان رکنے
لگے۔ اچھی نشر کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں روانی ہوتی ہے، رکاوٹ
نہیں ہوتی۔ محض مثال کے طور پر اس جملے کو دیکھیے : ”تم یہاں سے کل کیا چلے
گئے کہ گھر کی رونق ہی چلی گئی“ اس جملے کا مطلب تو روشن ہے، مگر بیان
کا حسن نہیں پایا۔ جملے کے پہلے ٹکڑے ”کل کیا گئے کہ“ کو زبان سے ادا
کرتے وقت روانی کی سانس ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اس جملے میں جتنے لفظ آئے ہیں، ان سب کی بھی ضرورت
نہیں تھی۔ ان میں سے ایک دو لفظوں کو کم کیا جاسکتا ہے، مثلاً اس
طرح : ”گھر کی رونق تمہارے ساتھ ہی چلی گئی تھی“ مطلب پورا کا پورا
ادا ہو گیا اور اب اچھی طرح ادا ہوا کہ بیان کا حسن بھی شامل ہو گیا ہے۔

ہاں اس جملے کو یوں بھی لکھا جاسکتا تھا : ”گھر کی رونق تو تمہارے
ساتھ ہی چلی گئی تھی“ مگر یہ بہتر صورت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ
”تو تمہارے“ میں ت کے دو بار ایک ساتھ تلفظ میں آنے سے روانی
کم ہو جاتی ہے۔ اس جملے کو ایک بار پڑھ کر دیکھیے، آپ خود محسوس
کریں گے کہ ”تو تمہارے“ کو ادا کرتے وقت زبان میں گتلت سی آ جاتی
ہے۔ یہ خوبی نہیں، خامی ہے ”کل کیا گئے کہ“ میں بھی یہی خامی تھی۔

کسی اچھے جملے کو دو تین بار پڑھیے، آپ محسوس کریں گے کہ ایک خاص طرح
کا آہنگ اور ایک خاص طرح کی نغمگی اس کے اندر موجود ہے۔ جملے میں
جتنی روانی ہوگی، اسی نسبت سے اس میں وزن اور آہنگ کی لہریں پیدا ہوں گی۔
روانی ٹوٹنے لگے گی، تو وہ آہنگ بھی ٹوٹنے لگے گا۔

شاعری میں تو اس پہلو پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ ایک ہی مثال سے اس
کی وضاحت ہو جائے گی۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ مولانا شبلی نے

میر انیس کی شاعرانہ خوبیوں پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ دوسرے لکھے ہیں
 اُن دونوں مصرعوں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے۔ ایک مصرع یہ ہے :
 "تھا ببل حق گو کہ چمکتا تھا جن میں" اسی بات کو دوسرے مصرعے میں
 اس طرح کہا گیا ہے : "ببل چمک رہا تھا ریاض رسول میں" آپ نے
 دیکھا پہلے مصرعے میں روانی کی کمی ہے۔ لفظوں کے غیر مناسب انتخاب
 سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے۔ خاص کر "گو کہ" اسے روانی بے طرح ٹوٹ گئی
 ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا مصرع کیسا رواں ہے! پڑھ کر دیکھیے ،
 زبان کہیں کہیں نہیں رُکے گی۔ اسی خوبی نے اس مصرعے کو پہلے مصرعے سے بہتر
 بنا دیا ہے۔ اس سلسلے کی کچھ اور باتیں ذرا آگے چل کر بیان کی جائیں گی۔



جملے دو طرح کے ہوتے ہیں : مفرد، مرکب۔ "مرکب جملے" وہ ہوتے ہیں
 جو دو یا زیادہ مفرد جملوں سے مل کر بنے ہوں۔ مثلاً اس جملے کو دیکھیے : وہ
 کل یہاں سے گئے تھے، لیکن آج پھر واپس آگئے اور آتے ہی جم کر بیٹھ
 گئے! "مگر اُن کے آتے ہی کچھ دوسرے لوگ بھی آگئے اور وہ لوگ بھی اُن سے
 باتیں کرنے لگے، یوں سارا دن گزر گیا"

اس طویل جملے میں پانچ چھوٹے چھوٹے جملے شامل ہیں۔ لمبے مفرد جملے لکھنا
 یا طویل مرکب جملے لکھنا غلط نہیں۔ بہت سے مقامات پر اُن کی ضرورت ہوتی
 ہے۔ یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ مختصر جملوں میں اگر مفہوم آسانی کے ساتھ
 ادا ہو سکتا ہو، تو پھر طویل جملے لکھنے کی ضرورت نہیں، اسے غیر مناسب
 کہا جائے گا۔ مثال کے طور پر اوپر والے طویل جملے کو دیکھیے۔ اُس میں سے
 "لیکن"، "اور"، "مگر" یہ تین لفظ کم کر دیے جائیں، تو یہ ضرورت سے
 زیادہ لمبا جملہ، چھوٹے چھوٹے جملوں میں تقسیم ہو جائے گا : وہ کل ہی تو
 گئے تھے، آج واپس آگئے۔ آتے ہی جم کر بیٹھ گئے۔ اُن کے آتے ہی کچھ
 اور لوگ بھی آگئے۔ یہ لوگ بھی اُن سے باتیں کرتے رہے۔ یوں سارا

دن گزر گیا۔

لمبے لمبے جملوں میں کبھی یہ خرابی پیدا ہو جاتی ہے کہ زائد لفظ شامل ہو جاتے
 ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ مفہوم کی تکرار ہو جاتی ہے کہ ایک ہی بات کو بار بار
 کہا جاتا ہے۔ عبارت میں زائد یعنی فالتو لفظ ہوں، اسے عیب کہا جائے گا۔
 اسی طرح "فہوم کی تکرار ہو، تو اسے بھی خرابی مانا جائے گا۔ نئے لکھنے والوں
 کو شروع میں اس کا اچھی طرح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ جب مشق ہو جائے اور
 لکھنا آجائے، تب ضرورت کے مطابق ہر طرح کے جملے لکھے جاسکتے ہیں بشرط
 میں مفرد جملے کو مرکب جملے پر ترجیح دینا چاہیے۔ یہ بھی کوشش کرنا چاہیے
 کہ جملے ضرورت سے زیادہ طویل نہ ہوں۔

ایک مثال سے اس کی وضاحت اچھی طرح ہو سکے گی۔ ایک تنقیدی مضمون میں
 لکھے گئے اس جملے کو دیکھیے :

"مرزا عبد القادر بیدل، مرزا غالب اور مرزا یاس بیکانہ
 چنگیزی کی روایات فکر و فن کے امین، کلاسیکی زبان و ادب سے
 استادانہ واقفیت اور اپنے وسیلہ اظہار پر کمال و دسترس رکھنے
 والے، تجزیہ و تفسیر کے مراحل سے گزر کر اپنے پیرایہ بیان کو
 زیادہ سے زیادہ شخصی، انفرادی اور مکمل بنانے والے، زمان
 و مکان کے مسائل کو عشق و وجدان کے تناظر میں قلم بند کرنے
 والے شاعر نے اردو غزل میں کیسے کیسے گراں قدر اشعار کا اضافہ
 کیا ہے، جن کی کیفیت سدا بہار ہے، جن کی لطافت و اثر
 آفرینی قائم و دائم ہے"

یہ ایک جملہ ہے۔ جملہ کیا ہے، شیطان کی آفت ہے۔ اس سے لکھنے والے
 کا انٹری پن ظاہر ہوتا ہے۔ شروع میں مشق کم ہوتی ہے اور معلومات
 زیادہ نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ مختصر اور مفرد جملے لکھنے پر زور دیا جاتا
 ہے۔ ابتدا میں اچھی عبارت لکھنا آجائے، تو پھر یہ خوبی قلم کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔
 شروع میں اس طرف توجہ نہ کی جائے، تو پھر زندگی بھر اس خرابی کو بھرنا چھوڑنا

پڑتا ہے۔ اور جس طویل جملے کو نقل کیا گیا، وہ اس کا مثبت ہوتا ثبوت ہے۔
کبھی خواجہ حسن نظامی کا کوئی مضمون مل جائے، تو اسے دل لگا کر اور نظر جا کر
پڑھیے گا۔ آپ دیکھیں گے نہادہ تر مختصر جملے ہیں۔ بیان میں سادگی اور صفائی
ہے۔ عربی فارسی کے مشکل لفظ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں
نے عبارت کو چست بنا دیا ہے۔ غالباً تلفظوں کا پتا نشان نہیں ملے گا عبارت
اس صفائی کے ساتھ مطلب کو ادا کر رہی ہے جیسے نظر شیشے کے پار
ہو جاتی ہے۔ طراقت سے بھری ہوئی روانی ایسی ہے جیسے جھرنابہ رہا
ہو۔ اچھی نثر میں یہی خوبیاں ہوتی ہیں۔

عربی اور فارسی سے اردو نے بہت فیض پایا ہے۔ ان زبانوں کے بہت
سے لفظ اردو میں شامل ہیں۔ یہ لفظ ہماری زبان میں اس طرح گھل مل
گئے ہیں کہ غیریت باقی نہیں رہی۔ ان دونوں زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندی
اور بعض دوسری ہندوستانی زبانوں کے لفظ بھی ہماری زبان میں موجود
ہیں۔ پچھلے دو سو برسوں میں انگریزی کے بہت سے لفظ اردو میں شامل
ہو گئے ہیں۔ ہاں، یہ خیال رہے کہ عربی اور فارسی کے مقابلے میں،
دوسری زبانوں کے لفظوں کی تعداد زیادہ ہے۔ فعل تو سب ہندی سے
آئے ہیں (البتہ اردو نے ان کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے)۔
محاورے اور کہاوتیں (درب الامثال) ایسے کیسے ہوتے ہیں جن میں
اس ملک کی تہذیب کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ محاورے عام طور
پر ہماری مشترکہ تہذیب کے عکس دکھاتے ہیں۔ اسی طرح کہاوتوں میں
ہماری زندگی کی چھوٹی چھوٹی تصویریں نظر آتی ہیں۔ محاوروں اور کہاوتوں
میں عربی، فارسی الفاظ کی تعداد کم سے کم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اردو ایک ملی جلی زبان ہے۔ اس میں عربی، ہندی
کے لفظ اچھی خاصی تعداد میں ہیں، لیکن دوسری زبانوں کے لفظوں
کی تعداد زیادہ ہے۔ مختلف زبانوں کے لفظ مل جل کر ایک ہی زبان
کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ اب ہم ان سب لفظوں کو اردو کے لفظ

مانتے ہیں۔ اس کو یوں بھی دیکھیے کہ ایسے اکثر لفظوں کا اطلاق تو نہیں بدلا، لیکن
تلفظ بہت سے لفظوں کا بدل گیا۔ عربی، فارسی کے لفظوں کو ہم ان زبانوں
کے تلفظ کے مطابق زبان سے ادا نہیں کرتے، کر بھی نہیں سکتے۔ اردو
والوں کا جو تلفظ ہے، اس کے مطابق سبھی لفظ استعمال میں آتے
ہیں۔ کوئی کہے بھی کہ عربی میں تو اس لفظ کا تلفظ یہ ہے، تو ہم کہتے ہیں کہ
ہاں، جب عربی بولیں گے تو یہی تلفظ اختیار کر لیں گے۔

نکلتے وقت ہم یہ نہیں دیکھتے کہ عبارت میں جو لفظ آئے ہیں، وہ اصل کس
زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔ ہاں، ہم ایک پہلو پر
ضرور نظر رکھتے ہیں کہ ممکن حد تک مشکل لفظ ہماری عبارت میں نہ آنے
پائیں۔ مفہوم کو ادا کرنے کے لیے آسان لفظ موجود ہیں، تو پھر مشکل
لفظوں کو عبارت میں نہیں ٹھونسن چاہیے۔ اس ٹھونسن ٹھانسن سے عبارت
بے لطف ہو جاتی ہے، بندش کی چستی باقی نہیں رہتی اور روانی ختم
ہو جاتی ہے۔ چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا اسی کو کہتے ہیں۔ پڑھتے وقت
لغت کی کتاب سامنے رکھنا ضروری ہو، تو وہ نثر کیا ہوئی، یہ تو بے کمالی
بلکہ بے ہنری کی پہچان ہے۔

مثال کے طور پر اس مختصر سی عبارت کو دیکھیے: "مجھے جب بھی
اشتہا ہوتی تھی، میں فواکھات سے شکم پُری کر لیا کرتا تھا۔ اسی طرح
وہ شش ماہہ مدت گزر گئی اور بوم رہائی آگیا۔"
کس قدر بے ہنگم عبارت ہے! مشکل لفظوں کے پتھر بچھا دیے گئے
ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تکھنے والے کو خوشش مذاقی چھو بھی نہیں گئی۔ اس
عبارت کو اس طرح بھی کھا جاسکتا تھا: "مجھے جب بھی بھوک لگتی
تھی، پھلوں سے پیٹ بھر لیا کرتا تھا۔ اسی طرح وہ چھ مہینے گزر گئے
اور رہائی کا دن آگیا۔"

لفظوں کے انتخاب میں خاص طور پر اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔
مثال کے طور پر "حتی الامکان"، "کی جگہ"، "امکان بھر"، اور "علیٰ الصباح"،

کے بجائے ”صبح تڑکے“ کہہ سکتے ہیں۔ یا جیسے: ”یہ امر میرے لیے باعث مسرت ہوگا“ اس کی جگہ سادہ سا جملہ لکھا جاسکتا تھا، مثلاً: اس سے مجھے مسرت حاصل ہوگی۔ یا ایسا ہی کوئی اور جملہ: ”امر“ اور ”باعث“ جیسے مشکل لفظ نکلنے کی کیا ضرورت ہے، جب کہ ان کے ہم معنی آسان لفظ موجود ہیں۔

ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جس طرح عربی فارسی لفظوں سے خواہ مخواہ پینا غیر مناسب ہے، اُسی طرح بے ضرورت اُن کو عبارت میں شامل کرنا بھی مناسب نہیں۔ لفظوں کے انتخاب میں بس یہ پہلو سامنے رہنا چاہیے کہ مطلب صحیح طور پر ادا ہو جائے اور ممکن حد تک عبارت میں سادگی رہے۔ اس کے بجائے اگر علم کی نمائش مقصود ہو تو اس کو بدذوقی اور نامعقولیت کہا جائے گا۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ نکلنے والا اناڑی ہے۔



دو طالب علم باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا: ”مارنگ میں ایک فرینڈ کے گھر گیا تھا۔ پھر فادر کے ساتھ شاپنگ کرنے نکل گیا۔ آفرون میں پلے گراؤنڈ پر گیا۔ وہاں ٹی بریک کے بعد کھیل کی بگنگ بس ہوئی تھی۔“ آپ نے ضرور محسوس کر لیا ہوگا کہ ان صاحب کی گفتگو میں انگریزی کے لفظ غیر ضروری طور پر استعمال میں آئے ہیں۔ انگریزی کے بہت سے لفظ ہماری زبان میں شامل ہو چکے ہیں اور وہ زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔ یہ ایسے لفظ ہیں جن کا بدل ہمارے پاس موجود نہیں۔ جیسے: اسٹیشن، اسکول، میزائل، تھرما میٹر، آڈیٹر، آکسیجن، ہائڈروجن، ناول، فلم، ٹیلی ویژن، ریفریجیٹر، لائڈا اسپیکر، ٹیبل، غرض کہ ایسے بہت سے لفظ ہیں۔ اب یہ سب لفظ اردو کے اپنے لفظ ہیں۔ اگر کوئی شخص مثلاً لائڈا اسپیکر کی جگہ ”آؤٹ کبیر الصوت“ استعمال کرے یا جیسے تھرما میٹر کی جگہ ”مقیاس حرارت“ کہے، تو سمجھا جائے گا کہ یہ شخص زبان کو مشکل اور بوجھل بنانا

چاہتا ہے، اس کو اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔ اسی طرح جن لفظوں کے بدل ہمارے پاس پہلے سے موجود ہیں، اُن کی جگہ انگریزی لفظ لانا بے نیکی پن کی بات ہے۔ اس سے گفتگو اور تحریر، دونوں کا رنگ بگڑ جائے گا۔ اوپر جس گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہے، اُس کا بھی یہی احوال ہے۔ اسے بگڑی ہوئی اردو کہا جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں انگریزی کے جتنے لفظ آئے ہیں، وہ سب غیر ضروری طور پر بھرے گئے ہیں۔ آسانی کے ساتھ یہ کہا جاسکتا تھا کہ میں صبح کے وقت ایک دوست کے گھر گیا تھا۔ پھر والد صاحب کے ساتھ کچھ خریدنے کے لیے بازار چلا گیا۔ سہ پہر کو کھیل کے میدان میں پہنچا، وہاں چائے کے وقفے کے بعد کھیل بس شروع ہوا تھا۔

ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر نے دسمبر۔ فروری ۱۹۹۲ء کے شمارے میں لکھا ہے: ”ساجد اکادمی جیسے معتبر ادارے کے اعلان سے بہت پہلے انعام پانے والے کا نام معذوقہ انداز میں سرکولیشن میں آتا رہا ہے۔“ سرکولیشن میں آتا رہا ہے، بے جوڑ لکڑ لہے۔ یہاں انگریزی کا ایک لفظ غیر ضروری طور پر شامل عبارت ہو گیا ہے۔ اس کی جگہ عام فہم اردو لفظ بہ آسانی لایا جاسکتا تھا۔ ایسی بے جوڑ سیوندکاری عبارت کو خراب کر دیا کرتی ہے۔ پُرانے لوگ ایسی زبان کو ”گوراست“ ہی اردو، کہا کرتے تھے۔ ایسی گفتگو یا تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص بدذوق بھی ہے اور مناسب و غیر مناسب لفظوں کے انتخاب اور استعمال میں جو فرق ہوتا ہے، اُس سے بھی واقف نہیں۔



عبارت کی خرابی میں زائد لفظوں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔ زائد لفظوں سے مراد ہیں ایسے لفظ جن کو اگر نکال دیا جائے، تو مفہوم پر اثر نہ پڑے اور عبارت پہلے سے بہتر ہو جائے۔ پینڈت ہری چند آخر اپنے زمانے کے مشہور شاعر اور ادیب تھے۔ انھوں نے ایک بار ایک نئے نکلنے والے سے کہا تھا: یہ تو بہنوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کیا لکھنا ہے، لیکن یہ بات کم لوگوں

کو معلوم ہوتی ہے کہ کیا نہیں نکھنا ہے۔ کیسی اچھی بات کہی تھی ! ایک مشہور مجسم ساز سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ اس قدر خوب صورت مجسمے کیسے بنالیتے ہیں۔ اُس نے جواب دیا : میں پتھر کی رسل میں سے خالتو جتنے نکال دیتا ہوں۔ ہا کمال استاد نے ایک جملے میں پوری بات کہہ دی اور بات بھی کیسی جس کی تشریح کی جائے تو کئی صفحے لکھے جاسکتے ہیں۔

○ — اس جملے کو دیکھیے : چوں کہ وہ بیمار تھے، اس لیے میں اُن کو دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ اب اس جملے کو اس طرح نکھ کر دیکھیے : وہ بیمار تھے، اس لیے میں اُن کو دیکھنے گیا تھا۔ مفہوم وہی رہا، اُس میں ذرا سی بھی کمی نہیں ہوئی، چوں کہ ”اور“ کے لیے ”کے“ نکل جانے سے جملہ بہتر ہو گیا۔

○ — ایک اور جملہ : وہ اگرچہ مصروف نہیں تھے، مگر وہ میرے پاس نہیں بیٹھے۔ اس کو اس طرح نکھ کر دیکھیے : وہ مصروف نہیں تھے، مگر میرے پاس نہیں بیٹھے۔ جملے کے شروع میں ”اگرچہ“ زائد ہے۔ اسی طرح ”وہ“ کی تکرار بھی غیر ضروری ہے۔ دو زائد لفظ نکل گئے تو جملہ بہتر ہو گیا۔

○ — ”ہم نے سارا سامان تیار کر لیا تھا، مگر اس کے باوجود انھوں نے یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کیا، شام ہی کو چلے گئے۔“ دوسرے جملے کے شروع میں ”مگر اس کے باوجود“ آتا ہے۔ اس میں سے ”مگر“ کو نکال دیجیے اور یوں نکھ کر دیکھیے : ہم نے سارا سامان تیار کر لیا تھا، اس کے باوجود انھوں نے اب اسی کو یوں لکھیے : ہم نے سارا سامان تیار کر لیا تھا، مگر انھوں نے یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کیا۔ دونوں صورتوں میں عبارت ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ”مگر“ اور ”اس کے باوجود“ میں سے ایک نکلنا زائد ہے۔

○ — ”وہاں ایسی کوئی جگہ موجود نہیں کہ جہاں مسافر کسی سایہ دار درخت کی چھائوں میں بیٹھ سکے۔“ اسی مرتب جملے کو اس طرح نکھ کر دیکھیے : وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں مسافر کسی سایہ دار درخت ... بات بھی مکمل ہو گئی اور بیان کے لحاظ سے عبارت بھی بہتر ہو گئی۔ اب

معلوم ہوا کہ پہلے جملے میں ”کہ“ اور ”موجود نہیں“ دو نکلنے والے تھے۔ ان سے اصل مفہوم میں کسی طرح کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ ان کے نکال دینے سے اصل مفہوم میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ بیان کے لحاظ سے یہ جملہ پہلے جملے کے مقابلے میں بہتر ہو گیا۔

”سایہ دار درخت کی چھائوں“ سے مجھے اردو کے مشہور شاعر حفیظ جون پوری کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ گیا :

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھائوں گھنی ہوتی ہے

ہاں کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

کیسی سچی بات کہی ہے اور کیسے اچھے ڈھنگ سے کہی ہے۔

○ — ”محمود وہاں گئے تو ہیں، لیکن دیکھیے کیا ہوتا ہے۔“ قواعد کے مطابق اس جملے میں کوئی عیب نہیں۔ اچھا اب اسے اس طرح نکھ کر دیجیے : محمود وہاں گئے تو ہیں، دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ مفہوم میں کمی نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے جملوں میں ”لیکن“ نہ لکھا جائے تب بھی جملہ ہر لحاظ سے مکمل رہے گا۔

مگر، لیکن، اگر، چوں کہ، کہ، اگرچہ : یہ سب کام کے لفظ ہیں۔ مرکب جملوں میں ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ بعض دفعہ ان کے بغیر مرکب جملے میں ربط پیدا نہیں ہو پاتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی ان کے بغیر جملہ مکمل ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ان کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں پہلو سمجھنے والے کی نظر میں رہیں۔

○ — ”یہ مانا کہ آپ وہاں نہیں جائیں گے۔“ اس جملے میں قواعد کے لحاظ سے کوئی عیب نہیں، اس کے باوجود اس میں سے ”کہ“ نکل سکتا ہے : یہ مانا آپ وہاں نہیں جائیں گے۔ بات مکمل ہے، کسی طرح کی کمی پیدا نہیں ہوئی، البتہ بیان کی خوبی کچھ بڑھ گئی۔

○ — ”غرضیکہ وہ سب لوگ دوبارہ وہیں چلے گئے۔“ غرضیکہ“ لکھنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ ”غرضیکہ“ کا فی ہے۔ اس کی جگہ ”انغرض“

بھی لکھا جاتا ہے، مگر اس میں عربی پن زیادہ ہے۔ "غرض کہ" مناسب نہ رہا ہے۔
○ اسی انداز کا ایک مرکب لفظ "گویا کہ" ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں صرف "گویا" لکھا جائے، تب بھی مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے گا اور قواعد کے لحاظ سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔

○ "یعنی کہ" بھی کبھی دیکھنے اور سننے میں آجایا کرتا ہے۔ اس میں "کہ" زائد ہے، "یعنی" کافی ہے۔

○ ایک مشہور لکھنے والے نے لکھا تھا: "حال آنکہ انھیں شائع ہونے کی بڑھ مہدی سے زیادہ کا زمانہ گزر چکا ہے"۔ زیادہ کا زمانہ "میں" کا "زمانہ" ہے۔ "ڈیڑھ صدی سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے" لکھنا بہتر ہوتا۔

○ "اب تم کدھر کو جاؤ گے؟" پہلی ہی نظر میں معلوم ہو سکتا ہے کہ "کدھر کو" میں "کو" زائد ہے۔ "اب تم کدھر جاؤ گے" بہتر انداز بیان ہوگا۔

○ "وہ اُدھر کو گئے ہیں"۔ اس میں بھی "کو" زائد ہے۔ وہ اُدھر گئے ہیں، لکھنا مناسب ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کر دی جائے۔ اُدھر کو، اُدھر کو، کدھر کو استعمال میں آئے ہیں، شاعروں کے یہاں خاص طور پر۔ مثلاً مولانا حالی کا مشہور مصرع ہے: چلو تم اُدھر کو، ہوا ہو جدھر کی۔ اس بنا پر ہم ان لفظوں کو غلط نہیں کہیں گے، البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ شاعروں کی پیروی نہیں کرنا چاہیے۔ شاعروں کو تو بہت سی آزادیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ہم ان پر اعتراض نہیں کریں گے، لیکن جب ہم نثر لکھیں گے تو خیال رکھیں گے کہ زائد لفظ جملے میں نہ آئے پائیں۔ اس وجہ سے ہم "اُدھر کو" نہیں لکھیں گے، صرف "اُدھر" لکھیں گے۔ اسی طرح جدھر اور کدھر۔

○ "اگرچہ" صحیح لفظ ہے، استعمال میں آتا ہے۔ بعض لوگ یہ غضب کرتے ہیں کہ "اگرچہ کہ" لکھتے ہیں۔ "اگرچہ" کافی ہے۔ "کہ" بے ضرورت ہے، اس کی گنجائش ہی نہیں۔

ہاں "بہ شرط کہ" ٹھیک ہے، اسے بلا تکلف لکھا جاسکتا ہے۔ لکھا بھی جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں فارسی پن نمایاں ہے۔ آپ اگر اپنی نثر میں اس کی جگہ "بہ شرط یہ ہے" لکھیں تو بہتر ہوگا۔ شروع میں بھاری بھر کم لفظوں سے ممکن حد تک بچنا چاہیے؛ مثلاً: میں آجاؤں گا، شرط یہ ہے کہ آپ بھی صبح وقت پر آئے گا وعدہ کریں۔

○ "انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم نہیں آؤ گے، تو بننا یا کام بگڑ جائے گا"۔ اس جملے میں دو لفظ "کہ اگر" ایک ساتھ آئے ہیں۔ ان کا ساتھ ساتھ آنا قواعد کے لحاظ سے غلط نہیں، لیکن ایسے اکثر جملوں میں محسوس یہی ہوتا ہے کہ اچھا ہوتا اگر یہ دونوں اس طرح ایک ساتھ نہ آتے۔ حسن بیان کے لحاظ سے مناسب یہی ہوگا کہ "اگر" اور "کہ" ساتھ ساتھ نہ آئیں۔ مثلاً اس جملے کو یوں بھی لکھا جاسکتا ہے: انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تم اگر نہیں آؤ گے۔۔۔۔۔ ایک لفظ کے بیچ میں آجانے سے بیان پہلے سے بہتر ہوگا۔

اب اس جملے کو دیکھیے: "وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس دفعہ فیل ہو گیا تو بہت رُسوائی ہوگی"۔ یہاں بھی وہی بات ہے۔ اسے یوں لکھا جاسکتا ہے: وہ سوچ رہا تھا کہ اس بار بھی اگر فیل ہو گیا تو۔۔۔۔۔

اب ایک اور بات: اس جملے میں "اگر" نہ لکھیں تب بھی کوئی کمی نہیں محسوس ہوگی، یعنی: وہ سوچ رہا تھا کہ اس دفعہ بھی فیل ہو گیا تو بہت رُسوائی ہوگی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے جملے بھی ہوتے ہیں جن میں "کہ" کے ساتھ یا جملے میں کسی اور جگہ "اگر" لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بہتر یہی ہوگا کہ ایسے جملوں میں "اگر" نہ لکھا جائے۔

آپ ان دونوں جملوں کو ایک بار نظر جما کر پڑھیے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ پہلے جملے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ اس میں "اگر" سے بیان میں زور بڑھ جاتا ہے،

یوں اس جملے میں ”اگر“ نکھنا ضروری ہے۔ اس کے برخلاف، دوسرا جملہ ایسا ہے کہ اس میں سے ”اگر“ کو بہ آسانی کم کیا جاسکتا ہے۔ اداے مطلب پر ذرا بھی اثر نہیں پڑے گا، البتہ بیان کا حسن بڑھ جائے گا۔ ایسے جملے نکھتے وقت اس پہلو پر بھی نظر رکھنا چاہیے۔

○ ایک صاحب نے حظ میں نکھا تھا: ”آپ نے پھر تقاضہ کیا اور دھکی بھی دی ہے، دریاں حایکے میں پھیلے ہفتے آپ سے کہ چکا ہوں کہ بہت جلد وہ رقم آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔“

اس عبارت میں ”دریاں حایکے“ کس قدر بھاری بھر کم لفظ ہے! اس کی جگہ ”حالاں کہ“ نکھا جاسکتا تھا۔ دریاں حایکے ”اور دھکیکے“ ایک ہی انداز کے لفظ ہیں۔ ان کی جگہ ”غرض کہ“ اور ”حالاں کہ“ نکھنا چاہیے۔ اوپر جو عبارت نقل کی گئی، اس میں ایک غلطی املا کی ہے ”تقاضا“ نکھا گیا ہے، لیکن اس لفظ کا صحیح املا ”تقاضا“ ہے۔ ایسے کئی لفظ ہیں جن کے آخر میں الف ہے، مگر غلطی سے ان کے آخر میں ک نکھ دی جاتی ہے۔ ان کا مفصل بیان املا کے حصے میں ملے گا۔

○ لفظوں کی غیر ضروری تکرار بڑا عجیب ہے، اس سے بچنا چاہیے۔ مثال کے طور پر اس جملے کو دیکھیے: ”میں نے کہا ضرور تھا کہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا، لیکن میں کیا کرتا، مجھے فرصت ہی نہیں ملی۔“

اسے اس طرح نکھ کر دیکھیے: میں نے کہا ضرور تھا کہ تمہارے ساتھ چلوں گا، لیکن کیا کرتا، فرصت ہی نہیں ملی۔ دو جگہ ”میں“ اور ایک جگہ ”مجھے“ یہ تینوں لفظ غیر ضروری ہیں، یعنی زائد ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ ایسے زائد لفظ عبارت کے حسن کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اچھی عبارت وہ ہے جس میں لفظی کفایت شعاری سے کام لیا گیا ہو۔ زائد لفظ نہ ہوں، غیر ضروری طور پر لفظوں کی تکرار نہ ہو اور ممکن حد تک ایسے لفظ نہ ہوں جنہیں عربی فارسی کے بھاری بھر کم لفظ کہا جاسکے۔ نیز غیر ضروری انگریزی لفظوں کے بے جوڑ ہوند نہ لگائے گئے ہوں۔

○ ”تم کبھی بھی اس کام کو مکمل نہیں کر سکو گے۔“ اس جملے میں کوئی خرابی ہے؟ غور سے دیکھیے۔ اچھا! اسی جملے کو اس طرح نکھ کر دیکھیے: تم کبھی اس کام کو مکمل نہیں کر سکو گے۔ بات پوری ہوگئی! معلوم یہ ہوا کہ ”کبھی بھی“ کی جگہ ”کبھی“ نکھنا کافی تھا۔ ”بھی“ زائد ہے۔ اصل مفہوم سے اس لفظ کا کچھ تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ ”کبھی بھی“ بولنے میں کتنا برا لگتا ہے! ○ ”تم ابھی بھی نہیں سمجھ پائے کہ ان کا ارادہ کیا ہے؟“ اس جملے میں ”ابھی بھی“ کی جگہ ”اب بھی“ نکھ کر دیکھیے یا آپ محسوس کریں گے کہ انداز بیان کے لحاظ سے جملہ بہتر ہو گیا ہے۔ ”کبھی بھی“ کی طرح ”ابھی بھی“ کو بھی عبارت میں شامل نہ ہونے دیجیے۔ تلفظ کے لحاظ سے ”بھی بھی“ کے مقابلے میں ”اب بھی“ سبک اور رواں ہے۔

○ ”اس کے باوجود بھی تم ان کی تعریف کر رہے ہو۔“ ”بھی“ بہاں بھی زائد ہے۔ ”اس کے باوجود تم ان کی تعریف کر رہے ہو“ نکھنا چاہیے تھا۔ یاد رکھیے کہ ”اس کے باوجود“ کے بعد ”بھی“ نکھنے کی ضرورت نہیں۔

○ ایک صاحب نے لکھا تھا: ”اس کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں وہاں تھیں۔“ اس جملے میں ”اس کے علاوہ بھی“ کس قدر بجا معلوم ہوتا ہے! ”اس کے علاوہ“ اور ”بہت سی چیزیں وہاں تھیں“ نکھا جاسکتا تھا۔ یوں بھی نکھ سکتے تھے: ”اس کے علاوہ اور بھی چیزیں وہاں تھیں“ مطلب یہ ہے کہ ”بھی“ اور ”اس کے علاوہ“ کو ایک ساتھ نہیں لانا چاہیے۔

○ ”صرف“ اور ”ہی“ ایسے لفظ ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔

ذرا دیر کے لیے مان لیجیے کہ جملہ اس طرت کھایا گیا: "صرف میں ہی اس کام کو انجام دے سکتا ہوں"۔ اس میں "صرف" اور "ہی" میں سے ایک لفظ زائد ہے۔ اس جملے کو یوں نکھ کر دیکھیے: "میں ہی اس کام کو انجام دے سکتا ہوں"۔ بات مکمل ہو گئی نا! یہ مثالیہ جملہ: "صرف نئی تعلیم ہی سماجی شعور پیدا کر سکتی ہے"۔ اسی جملے کو اگر یوں نکھاجاتا: "صرف نئی تعلیم سماجی شعور پیدا کر سکتی ہے"۔ تب بھی بات مکمل ہو جاتی اور مگر کا عیب پیدا نہ ہوتا۔ "صرف میں ہی" نکھنا ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے سنلاٹ سوپ صاحب، یا شب قدر کی رات۔

"صرف" اور "ہی" ان کو ایک ساتھ نہ لائیے۔ بات تو "صرف" دیکھیے یا "ہی" دیکھیے۔ اکثر صورتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ "ہی" بہتر معلوم ہوتا ہے۔ مثالیہ جملہ: "اب تو صرف خدا مدد کر سکتا ہے"۔ اسے اگر اس طرح نکھاجائے: "اب تو خدا ہی مدد کر سکتا ہے" تو صاف طور پر محسوس ہوگا کہ حسن بیان اور زور بیان، دونوں کے لحاظ سے جملہ بہتر اور پُر زور ہو گیا ہے۔

○ "فقط میں ہی نہیں گیا"۔ اس جملے میں بھی وہی عیب ہے۔ "فقط" اور "ہی" ایک ہی مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔ میں ہی نہیں گیا۔ نکھنا کافی تھا۔ جس طرح "صرف" کے ساتھ "ہی" کو جمع نہیں کرنا چاہیے، اسی طرح "فقط" اور "ہی" کو بھی ایک ساتھ نہیں لانا چاہیے۔

○ ایک صاحب نے اپنے مضمون میں نکھنا تھا: "یہ تبدیلیاں صرف بمبئی ہی تک محدود نہیں تھیں"۔ اس جملے میں "صرف" اور "ہی" میں سے ایک لفظ زائد ہے۔ اس سے مفہوم میں کچھ اضافہ نہیں ہوا، البتہ بیان کا حسن کم ہو گیا، بل کہ یوں کہیے کہ بگڑ گیا۔ یہ تبدیلیاں بمبئی تک محدود نہیں تھیں، نکھاجا سکتا تھا۔

○ "نہ تم وہاں گئے، نہ ہی وہ یہاں آئے"۔ نہ تم بات سنستے ہو، نہ ہی وہ اس طرف توجہ کرتے ہیں۔ "دونوں جملوں میں "ہی"

زائد ہے۔ اس سے جملوں میں بھڑپاں پیدا ہو گیا ہے۔ "نہ ہی" کے بجائے صرف "نہ" نکھنا چاہیے تھا: نہ تم وہاں گئے، نہ وہ یہاں آئے۔ نہ تم بات سنستے ہو، نہ وہ اس طرف توجہ کرتے ہیں۔

○ اس جملے کو دیکھیے: "یہ صرف دہلی ہی سے مخصوص نہیں ہے"۔ اس ایک جملے میں صرف "ہی" مخصوص، یہ بین لفظ ایسے ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کر رہے ہیں۔ اگر ایسے یوں نکھاجاتا: "یہ دہلی سے مخصوص نہیں" تو دو زائد لفظ عبارت میں شامل نہ ہو پاتے۔ اس کے ساتھ ساتھ "نہیں ہے" میں سے بھی ایک لفظ کم ہو جاتا۔ مفہوم اور حسن بیان، دونوں کے لحاظ سے اس جملے میں "نہیں" کے ساتھ "ہے" لانے کی ضرورت نہیں۔ ایک چھوٹے سے مفرد جملے میں سے تین لفظ بہ آسانی کم کر دیے گئے۔ معنی مطلب میں ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا، ذرا سی بھی کمی نہیں ہوئی، ہاں یہ ضرور ہو کہ بندش کی چستی بڑھ گئی اور بیان کا حسن بھی بڑھ گیا۔



"ہی" کے متعلق ایک ضروری بات سمجھ لیجیے۔ یہ قاعدہ ہے کہ "ہی" کا تعلق جس لفظ سے ہوگا، یہ اسی کے ساتھ آئے گا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی اور لفظ نہیں آئے گا۔ مثال کے طور پر اس جملے کو دیکھیے: "یہ خط ڈاکٹر صاحب کے ہی ہاتھ میں دینا"۔ اس جملے میں "ہی" کا تعلق "ڈاکٹر صاحب" سے ہے، اس لیے یوں نکھنا چاہیے تھا: یہ خط ڈاکٹر صاحب ہی کے ہاتھ میں دینا۔ "کے" نے بیچ میں آکر جملے کو خراب کر دیا۔

"وہ دہلی میں ہی ملازمت ڈھونڈیں گے"۔ اس جملے میں "ہی" کا تعلق "دہلی" سے ہے، اس طرح نکھنا چاہیے تھا: وہ دہلی ہی میں ملازمت ڈھونڈیں گے۔ ایک صاحب نے تلفظ پر بحث کرتے ہوئے نکھنا تھا: "اُن الفاظ میں ہی تلفظ کی تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں جو استعمال میں زیادہ آتے ہیں"۔ بات تو ٹھیک ہے، مگر انداز بیان اچھا نہیں۔ "اُن الفاظ میں ہی" اس قدر

سمجھتا نکلتا ہے۔ روانی نام کو نہیں۔ اچھا اب اسے یوں لکھیے :
 ”اُنھی الفاظ میں تلفظ کی تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں۔۔۔۔۔“
 اب ذرا ان دونوں ٹکڑوں کو دو تین دفعہ پڑھیے۔ آپ خود محسوس کر لیں گے کہ
 ”اُن“ الفاظ میں ہی، کے مقابلے میں ”اُنھی“ الفاظ میں، روانی زیادہ ہے
 اور بیان کا حسن بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ”اُن ہی“ کے بجائے
 ”اُنھی“ لکھنا بہتر ہے۔

”اُنھی“ اصلاً مرکب لفظ ہے۔ یہ ”اُن“ اور ”ہی“ سے مل کر بنا ہے۔
 ”ہی“ میں شو شے دار ہے، جسے ہائے ہونے بھی کہتے ہیں۔ ”اُنھی“ میں
 یہی ء، دو چشمی ء میں بدل گئی۔ اس طرح تلفظ آسان ہو گیا۔ ”اُن ہی“
 میں ء کی آواز الگ سے نکلتی ہے۔ ”اُنھی“ میں تو ان کی آواز تھ میں مل جاتی
 ہے اور اس طرح دو حرفوں کی الگ الگ آوازیں ایک بن جاتی ہیں۔ اس
 طرح تلفظ کے لحاظ سے اس میں سبک پن پیدا ہو جاتا ہے اور روانی آ جاتی
 ہے۔

○ ذرا اس مرکب جملے کو دیکھیے : ”اس وقت ہم اُس
 ہی شخص کے متعلق بات کریں گے جو کل آیا تھا“۔ آپ اسے یوں
 لکھ کر دیکھیے : ”اس وقت ہم اُسی شخص سے متعلق باتیں کریں گے۔۔۔۔۔“
 آپ بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ جملہ پہلے والے جملے سے بہتر ہے۔ وجہ
 بس یہی ہے کہ ”اُس ہی“ کے بجائے ”اُسی“ لکھا گیا ہے۔

اس ہی، اُس ہی، اُن ہی، اُن ہی، وہ ہی، یہ ہی، سب ہی، جب ہی،
 تب ہی،۔۔۔۔۔ ان کی جگہ اُسی، اُنھی، اُنھی، وہی، یہی، سبھی،
 جی بھی، جی بھی بہتر معلوم ہوں گے۔ اس کا خیال رکھیے کہ جملوں میں اُنھی
 سے کام لیا جائے۔

میں نے ایک بار خط میں لکھا تھا : ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ
 وہ ہی کتاب بھیج دیجیے“۔ جن صاحب کو خط لکھا تھا، انھوں نے کتاب
 فوراً بھیج دی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ جناب : ”وہ ہی کتاب“ لکھنا آپ

نے کس سے لکھا ہے؟ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اُن کی بات ٹھیک ہے۔
 ”وہی کتاب“ لکھنا چاہیے تھا۔ وہ ہی، اور یہ ہی، غلط نہیں، مگر اچھا
 یہی ہے کہ ان کی جگہ ”وہی“ اور ”یہی“ لکھیں۔



جملوں میں زائد لفظ طرح طرح سے آجایا کرتے ہیں۔ یوں اس طرف توجہ
 کرنے کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ مثلاً اس جملے پر نظر ڈالیے : ”ہم اُن
 کے ساتھ میں بازار گئے تھے“۔ ”میں“ کی یہاں کچھ ضرورت نہیں۔ یا جیسے
 یہ جملہ : ”وہ اُنھی دنوں میں گھر گئے تھے“۔ یہاں بھی ”میں“ زائد ہے۔
 ”وہ اُنھی دنوں گھر گئے تھے“ کافی ہے۔

○ ”وہ شام میں آئے تھے“۔ یہ انداز بیان غیر مناسب
 ہے، نرا انگریزی کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ ”وہ شام کو آئے تھے“ لکھا جاسکتا
 تھا۔ شام کے وقت، بھی لکھ سکتے تھے۔

”شام میں“ اور ”صبح میں“ انگریزی کے ایسے ترجمے ہیں جو اردو کے انداز بیان
 سے میل نہیں کھاتے۔ اردو والے ”شام کے وقت“ یا ”صبح کے وقت“
 کہتے ہیں۔ ”شام کو“ بھی لکھتے ہیں۔

یہاں ایک بات خاص طور سے سمجھ لینا چاہیے۔ لفظوں کے استعمال میں تین اس
 ساتھ نہیں دیتا۔ مثلاً ہم سب ”رات میں“ اور ”دن میں“ لکھتے بھی ہیں اور
 بولتے بھی ہیں۔ جیسے : ”رات میں ستارے آسمان پر چمکتے ہیں“۔ اس سے
 یہ لازم نہیں آتا کہ ”شام میں“ یا ”صبح میں“ بھی درست ہو۔ اردو میں
 روزمرہ کی اصل حیثیت ہے اور اردو کے روزمرہ کے لحاظ سے ”شام میں“
 یا ”صبح میں“ لکھنا یا بولنا نامناسب ہے۔

○ ”وہ پاس میں بیٹھے ہوئے تھے“۔ یہ بھی مناسب
 انداز بیان نہیں۔ یہاں ”میں“ زائد ہے۔ ”وہ پاس بیٹھے ہوئے تھے“
 کافی ہے۔ تاکید سے کام لینا ہو، یعنی زور دینا ہو تو یوں لکھ سکتے ہیں :



جب نام سے پہلے ”ڈاکٹر“ یا ”پروفیسر“ لکھ دیا، تو پھر نام کے بعد ”صاحب“ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح جب نام سے پہلے ”جناب“ لکھ دیا، تو پھر نام کے بعد ”صاحب“ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر نام کے بعد ”صاحب“ لکھا ہے، تو پھر نام سے پہلے ”جناب“ لکھنا ضروری نہیں۔ ضروری کیا، مثلاً ”جناب“ ”ڈاکٹر صاحب“، ”جناب ڈاکٹر صاحب“، ”جناب پرنسپل صاحب“، ”جناب رام لال صاحب“، ”جناب محمود الہی صاحب“، ”ان سب ٹکڑوں میں ”جناب“ اور ”صاحب“ میں سے ایک لفظ زائد ہے۔

کس جگہ نام سے پہلے ”جناب“ لکھا جائے اور کہاں نام کے بعد ”صاحب“ لکھا جائے، اس کا تعلق اس سے ہے کہ وہاں کون سا لفظ مناسب ہوگا۔ مثلاً ”جناب پرنسپل“ اور ”پرنسپل صاحب“ میں آخری ٹکڑا بہتر ہے۔ اسی طرح بھائی صاحب، مولوی صاحب، ڈاکٹر صاحب لکھنا چاہیے۔

خاص ناموں سے پہلے ”جناب“ لکھنا بہتر ہو سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک نام کے ساتھ ”جناب“ اور ”صاحب“ کو جمع نہ کیجیے۔ ”جناب محمد حسین خاں“ کیجیے، یا ”محمد حسین خاں صاحب“۔ ”جناب محمد حسین خاں صاحب“ مناسب نہیں۔ اسی طرح مثلاً پروفیسر آل احمد سرور۔ اگر ”پروفیسر آل احمد سرور صاحب“ لکھا جائے، تو کہا جائے گا کہ یہاں ”پروفیسر“ اور ”صاحب“ میں سے ایک لفظ زائد ہے۔ اگر کسی نے ”جناب پروفیسر آل احمد سرور صاحب“ لکھا ہے، تو کہا جائے گا کہ ”جناب“ ”پروفیسر“ اور ”صاحب“ ان تین لفظوں میں سے دو لفظ زائد ہیں۔

اسی طرح جب نام سے پہلے ”شری“ لکھ دیا تو پھر آخر میں ”صاحب“ لکھنا ضروری نہیں۔ جیسے: ”شری موہن لال اگر وال“۔ اسے اگر ”شری موہن لال اگر وال صاحب“ لکھا جائے تو کہا جائے گا کہ یہاں ”شری“ اور ”صاحب“

میں سے ایک لفظ زائد ہے۔

بہت سے ناموں کے ساتھ اسم نسبت بھی شامل ہوتے ہیں، جیسے: ”فراق گورکھ پوری“، ”جگر مراد آبادی“، ”ظہیر احمد صدیقی“، ”شمس الرحمان ناردکی“، ”مدتیہ الرحمان قدوائی“۔ ایسے ناموں سے پہلے ”جناب“ لکھنا مناسب ہوگا۔ جیسے: ”جناب شمس الرحمان فاروقی“۔

اگر کسی وجہ سے آخر میں ”صاحب“ لکھنا پڑے، تو پھر اسے آخر میں لکھنا چاہیے، جیسے: ”ظہیر احمد صدیقی صاحب“، ”محمود سعیدی صاحب“، ”صاحب“ کو سچ میں نہیں آنا چاہیے، یعنی ”ظہیر احمد صاحب صدیقی“ لکھنا مناسب نہیں۔ اب سے پہلے خطوں میں لمبے چوڑے القاب آداب لکھے جاتے تھے، اسی طرح ”صاحب“، اور ”جناب“ کو بھی ساتھ ساتھ لایا جاتا تھا۔ اب وہ رٹیں بدل گئیں، وہ انداز باقی نہیں رہے۔ رات گئی، بات گئی۔ اب لفظی کفایت شعاری کا بھی لحاظ رکھنا جاتا ہے۔ ہندو آدمی کی طرح لفظوں کو بھی دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کر استعمال کیجیے۔ جھگڑا لو مردوں اور لڑکا عورتوں کی طرح لفظوں کو بے دردی کے ساتھ صرف میں نہ لائیے۔ فضول خرچی کرنے والوں کو ”شیطان کا بھائی“ کہا گیا ہے۔ لفظوں کی قدر و قیمت تو روپوں سے کہیں زیادہ ہے، اس صورت میں لفظوں کی فضول خرچی کرنے والوں کو کیا کہا جائے گا؟



لفظوں کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ جملے میں جتنے لفظ لکھے جائیں، ہر لفظ کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ”اس کا اطلاق کیا ہے“ (۲) معنی کیا ہیں۔ معنی کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس لفظ کو جملے میں کس جگہ اور کس ڈھنگ سے لانا چاہیے۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ کیا ہے۔ عبارت تو پڑھنے کے لیے لکھی جاتی ہے۔ اگر کوئی لکھنے والا اپنی لکھی ہوئی عبارت میں لفظوں

کو صحیح طور پر نہ پڑھ پائے، تو یہ بڑے شرم کی بات ہوگی۔
جن لفظوں کے معنی معلوم نہ ہوں، یا کچھ شک ہو، اُن کو جملے میں نہیں نکھنا
چاہیے۔ لغت میں دیکھ لینا چاہیے، یا استاد محترم سے پوچھ لینا چاہیے۔
جب اطمینان ہو جائے، تب نکھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں احتیاط
نہ کرنے سے بعض دفعہ بڑی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک صاحب اپنے مضمون میں یہ نکھنا چاہتے تھے
کہ فلاں صاحب کو بہت شہرت ملی۔ اس مطلب کو ادا کرنے کے لیے اُنھوں
نے لکھا: "اُن کی خوب تشہیر ہوئی"، یہ مضمون ایک محض میں پڑھا گیا
لوگوں نے "تشہیر" پر اعتراض کیا۔ اُن سے کہا گیا کہ اس سے تو اس مطلب
نکلتا ہے کہ وہ بہت رُسوا ہوئے، اُن کی بہت بدنامی ہوئی۔

اعتراض درست تھا۔ "تشہیر" کے معنی ہیں: رُسوا کرنا۔ پُرانے زمانے
میں سزا دینے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مجرم کا منہ کالا کر کے، اسے گدھے
پر بٹھا کر، شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر گھمبایا جاتا تھا۔ اس کو "تشہیر" کہتے تھے۔
مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب دربار اکبری میں ایک واقعہ لکھا ہے:

"لشکر خاں میر بخشی ایک دن شراب پی کر دربار میں آیا اور بدستیاں
کرنے لگا۔ اکبر بہت خفا ہوا۔ گھوڑے کی دم سے بندھوایا اور لشکر
خاں کو لشکر میں تشہیر کیا۔ سب نشتے ہرن ہو گئے۔"

(دربار اکبری صفحہ ۱۰۰)

اگر ہم اپنی عبارت میں شہرت کے معنی میں "تشہیر" لکھیں تو ہماری رسوائی
ہوگی۔ پڑھے لکھے لوگ کہیں گے کہ نکھنے والے کو اس لفظ کے معنی نہیں
معلوم۔

○ — ایک لفظ ہے "بکواس"۔ فضول گفتگو کے مفہوم میں آتا
ہے، جیسے: وہ تو بکواس کرتے ہی رہتے ہیں۔ "بکنا" مصدر ہے،
اسی سے "بکواس" بنا ہے۔ اگر کوئی صاحب مثلاً یہ لکھیں: "یہ فلم بکواس
ہے، تو ظاہر ہے کہ اس لفظ کا یہ صحیح استعمال نہیں ہوگا۔ سیدھا سا جملہ لکھا

جاسکتا تھا: یہ فلم خراب ہے۔ فلم کی خرابی پر زور دینا مقصود ہو تو "بہت"
کا لفظ بڑھا سکتے ہیں، مثلاً: یہ فلم تو بہت خراب ہے۔ "بکواس" کا یہاں کیا
کام۔ "بکواس" کا تعلق انداز گفتگو سے ہے۔

فکر کے معنی میں "شوچ" بعض لوگ بولتے اور لکھتے ہیں، جیسے: میری سوچ
کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔ یہاں سوال یہ نہیں کہ یہ لفظ صحیح ہے یا غلط۔ اصل
بات یہ ہے کہ یہ لفظ اس معنی میں مستعمل نہیں رہا، اس لیے بہت اجنبی معلوم
ہوتا ہے۔ یہ لفظ فکر کے معنی میں ابھی تک زبان میں گھل مل نہیں سکا، اس لیے
غیر مفید لگتا ہے۔ اچھا یہی ہے کہ اسے فکر کے معنی میں استعمال نہ کیا جائے۔

○ — "اب کے" اور "اب کی" دونوں لفظ صحیح اور مستعمل ہیں۔
یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ مفرد صورت میں "اب کے" لکھا جائے گا جیسے: اب
کے تم آؤ گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔ اب کے گئے نہ جانے
کب آؤ گے!

طر: اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

طر: اب کے بہار آئی تو سمجھو کہ ہم گئے

جب اس کے بعد کوئی لفظ اس سے متعلق ہو کر گئے گا، اس صورت میں یہ
دیکھا جائے گا کہ وہ لفظ مذکر ہے یا مؤنث۔ وہ لفظ اگر مذکر ہے تو
اس کے ساتھ "اب کے" آئے گا، جیسے: اب کے برس، اب کے سال۔

اگر وہ لفظ مؤنث ہے تو "اب کی" آئے گا، جیسے: اب کی بات۔ ایک
مثال ہے: اب کی بات اب کے ساتھ، جب کی بات جب کے ساتھ۔

ایک ضمنی بات — اوپر مثال کے طور پر "اب کے برس" بھی لکھا گیا ہے۔
اس سلسلے میں صرف یہ کہنا ہے کہ "برس" مذکر ہے نہ ایک برس گزر گیا،
کہیں گے، ایک برس گزر گئی، نہیں لکھیں گے۔ اس کی جمع "برسوں" بنے گی،
جیسے: مرے گھر وہ آئے تھے برسوں کے بعد۔ اس کی جمع "برسیں"
نہیں بنے گی۔ مثلاً "برسیں گزر گئیں" نہیں لکھیں گے

○ — سنہرا اور سنہری، دونوں لفظ استعمال میں آتے ہیں۔ یہ

اسم صفت ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ موصوف مذکر ہوگا تو سہرا، نکھیں گے، جیسے :
سہرا پھول، سہرا رنگ۔ ص : روپ بجلی کا سہرا ہے، پھل بادل۔
موصوف مؤنث ہوگا تو "سہری" نکھیں گے، جیسے : سہری رنگت، سہری جوتی۔
ص : تاکا ہے تو ثریا کی سہری بوتل۔



مصدر کے آخرین نام ہوتا ہے، جیسے علامت مصدر کہتے ہیں، جیسے : کرنا، سونا، جانا۔
جب مصدر کے ساتھ کوئی اسم آتا ہے، تب یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصدر
کو کس طرح نکھیں گے، مثلاً کتاب پڑھنا، نکھیں گے یا کتاب پڑھنی، کہیں گے؟
یہ کہا گیا ہے کہ اس قاعدے میں دہلی اور لکھنؤ والوں کا اختلاف ہے۔
دہلی والے اسم مؤنث کے ساتھ "نی"، لاتے ہیں، جیسے : روٹی کھانی، بات
کہنی، چلے پینی، راسے دینی، تصویر دیکھنی۔ اسم اگر مذکر ہو تو "نا"، لکھتے
ہیں، جیسے : پانی پینا، پلا کھانا، قلم اٹھانا، جواب دینا، لکھنا میں عام طور پر مصدر
کی علامت میں تبدیلی نہیں کرتے۔ اسم مذکر ہو یا مؤنث، ہر صورت میں "نا"،
برقرار رہتا ہے، مثلاً : کتاب پڑھنا، راسے دینا، چلے پینا، پانی پینا، روٹی
کھانا، بات کرنا، دعا کرنا، جادو جگانا۔

قہر گویا لاری، داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ایک طرحی مشاعرے میں انھوں نے
بھی غزل پڑھی۔ طرح کا جو مصرع تھا، اس میں قافیہ تھا : نظر۔ اور ردیف
تھی : ہونا۔ قہر کی غزل کا مقطع یہ تھا :

یہاں میں قہر اہل لکھنؤ بھی، اہل دہلی بھی

یہ کہتے ہیں سحر ہوئی، وہ کہتے ہیں سحر ہونا

یہ قاعدہ دہلی اور لکھنؤ کی نسبت کے ساتھ اسی طرح عمل میں آتا رہا ہے،
اس لیے ہمارے لیے دونوں صورتیں درست اور صحیح ہیں، لیکن اچھا یہی
ہوگا کہ کسی ایک طریقے کو مان لیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ مثلاً
کوئی صاحب "کتاب پڑھنا" یا "راسے دینا" لکھتے ہیں، تو ان کے لیے یہ

مناسب نہیں ہوگا کہ وہ ایک جگہ تو "کتاب پڑھنا" نکھیں اور کسی دوسری جگہ
"چلے پینی" یا "دعا کر نی" نکھیں۔ ایک ہی انداز کو اپنانا چاہیے۔



"نہیں" کے ساتھ "ہے" یا "ہیں" لانا بہت سے مقامات پر اچھا نہیں معلوم
ہوتا۔ صاف صاف دکھائی دیتا ہے کہ "ہے" یا "ہیں"، زائد لفظوں کی طرح
آئے ہیں۔ مثلاً اس جملے کو دیکھیے : "وہ شخص اپنی دکان پر موجود نہیں ہے"
یہاں "ہے" بے کار نظر آتا ہے۔ اس جملے کو اگر اس طرح لکھا جاتا : "وہ
شخص اپنی دکان پر موجود نہیں" تو بات بھی مکمل ہو جاتی اور بیان کے لحاظ
جملہ بہتر ہو جاتا۔ یا محض یہ طور مثال اس عبارت کو دیکھیے : "وہ کہیں آتے
جاتے نہیں ہیں، دن بھر گھر میں بیٹھے رہتے ہیں"۔ اسے اگر یوں لکھا جائے : "وہ
کہیں آتے جاتے نہیں، دن بھر گھر میں بیٹھے رہتے ہیں" تو واضح طور پر معلوم
ہوگا کہ یہ بہتر مصدر ہے۔ پہلے "ہیں" میں "نہیں" ہیں، "ہیں" صاف طور
پر زائد معلوم ہوتا ہے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ "نہیں" یا "نہیں" میں "ہے" دو نون مکرر ملے بہت سے
مقامات پر حسن بیان کے لحاظ سے زائد لفظ ہے۔ جب بھی فعل کی
اس صورت کو استعمال کیا جائے تو یہ ضرور دیکھ لیا جائے کہ اداے مطلب اور
حسن عبارت کے اعتبار سے صورت حال کیا ہے۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوگا
کہ اکثر مقامات پر "نہیں" اور "ہے"، کا ساتھ ساتھ آنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔
مثلاً : "کوئی شخص جان بوجھ کر نقصان اٹھانا گوارا نہیں کرتا ہے"۔ یہاں بھی
"ہے"، زائد معلوم ہوتا ہے۔ اس کی بہتر صورت یہ ہو سکتی ہے : "کوئی شخص
جان بوجھ کر نقصان اٹھانا گوارا نہیں کرتا"۔ زائد لفظ عام طور پر عبارت کو نگار
دیا کرتے ہیں، ایسے مقامات پر "ہے" بھی یہی کیا کرتا ہے "نہیں ہیں"
میں بھی بہت سے مقامات پر یہی خرابی چھپی ہوئی ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات ضرور نظر میں رہنا چاہیے کہ ایسے مقامات بھی سامنے

آتے میں جہاں "نہیں ہے" یا "نہیں ہیں" غیر مناسب نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً اس جملے کو دیکھیے: "یہ لفظ ابھی تک زبان میں آہل میں نہیں سکا ہے۔" اس جملے میں وہ بات نہیں جو مثلاً اس جملے میں ہے: "وہ گھر میں جاتے نہیں ہیں" یوں کہ اس آخری جملے میں "ہیں" غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

نکھنے والے کی یہ دوسری داری ہے کہ وہ دیکھ لے کہ "نہیں" کے ساتھ ہے "یا" ہیں۔" لانا کس مقام مناسب ہے اور کہاں غیر مناسب۔ مثلاً یہ پوچھا جاوے کہ وہ گھر میں ہیں؟ اس کا جواب صرف "نہیں" بھی ہو سکتا ہے اور "نہیں ہیں" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب یہ نکھنے والے پر ہے کہ وہ سمجھ لے کہ یہاں "ہیں" ضروری ہے یا غیر ضروری۔ ذرا اس عبارت کو دیکھیے:

"آپ نے "نگہت" لکھا ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اصل لفظ "نگہت" ہے۔ "تون" کے اوپر زبر ہے اور "تون" کے بعد کاف ہے، "گاف" نہیں ہے۔"

اس عبارت کے آخر میں "نہیں ہے" آیا ہے۔ "نہیں" کے بعد ہے، لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح "تون" کے اوپر، کے باب، "تون" پر، لکھنا بہت "تون" کے اوپر زبر ہے اور "تون" کے بعد کاف ہے۔ اس ٹکڑے میں "تون" کی تکرار کھلتی ہے، خاص کر یوں کہ دونوں لفظوں کے درمیان یہاں فاصلہ نہیں۔ اس عبارت کو اس طرح لکھا جاسکتا تھا:

"آپ نے "نگہت" لکھا ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اصل لفظ "نگہت" ہے۔ "تون" پر زبر ہے اور اس کے بعد کاف نہیں، "گاف" ہے۔"

اصل بات تو مکمل ہو گئی۔ اب ضمنی طور پر یہ کہنا ہے کہ واقعی اصل لفظ "نگہت" ہے۔ "تون" پر زبر ہے اور اس کے بعد کاف ہے ان کی "ت"۔ اس کے معنی ہیں: خوش بو۔ اسے "نگہت" نہیں لکھنا چاہیے اور بولنا چاہیے "تون" کے زبر کے ساتھ۔

ہاں شاعری میں "نہیں ہے" کچھ زیادہ ملتا ہے۔ شاعری کی بات الگ رہی

یہاں نشر کی بات ہو رہی ہے۔ نشر میں اس طرف خاص طور سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔



یہ بات نکھی جا چکی ہے کہ جملے میں جس قدر مفرد لفظ لکھے جائیں، ان کے معنی معلوم ہونا چاہیے۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ان کو جملے میں کس جگہ اور کس طرح لایا جائے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ عبارت میں اگر مرکب لفظ آئے ہوں تو ان کے متعلق بھی اطمینان کر لیا جائے۔

ایک مضمون میں یہ جملہ لکھا ہوا تھا: "اہل ہند کی کتابوں میں یہ سب باتیں نکھی ہوئی ہیں۔" "اہل ہند" صحیح ترکیب نہیں ہے۔ اہل ہند، ضرور صحیح مرکب ہے، اس کے معنی ہیں: ہندوستان والے۔ اس میں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی (وغیرہ) سب شامل ہیں۔ اس جملے میں "اہل ہند" کا محل نہیں، یوں لکھنا چاہیے تھا: "ہندوؤں کی کتابوں میں۔۔۔۔۔" "اہل ہندو" کے تو کچھ معنی ہی نہیں۔

○ کسی مضمون یا کتاب وغیرہ کی تعریف میں یہ لکھنا کہ یہ معرکہ الآرا مضمون یا کتاب ہے، یا مثلاً کسی غزل کی تعریف میں یہ کہنا کہ بڑے عرصے معرکہ الآرا غزل کہی ہے، درست نہیں۔ تعریف کے بجائے اس سے تو بُرائی ظاہر ہوگی، یعنی بات ہی بدل جائے گی۔ بل کہ یوں کہیے کہ بگڑ جائے گی۔

"معرکہ الآرا" کے معنی ہیں: جس میں اختلاف رائے بہت ہو۔ اصل میں "معرکہ الآرا" تھا، یعنی آخر میں ہمزہ بھی تھا، اردو میں اگر ہمزہ تو نکل گیا (اس لیے کہ وہ تلفظ میں نہیں آتا تھا) "معرکہ الآرا" رہ گیا۔ "آرا" جمع ہے "راے" کی۔ یہ عربی کا لفظ ہے۔

ایک اور مرکب ہے: معرکہ آرا۔ اس میں "آرا" فارسی کا لفظ ہے۔ "آراستن" مصدر سے بنا ہے۔ "معرکہ آرا" کے معنی "زبردست، پُر زور" بھی ہیں۔ اسی نسبت سے عمدہ غزل کو "معرکہ آرا" کہہ دیتے ہیں۔ معرکے کی غزل کہی

ہے، معرکہ آرا غزل کہی ہے؛ یہ صریح انداز بیان ہو گا۔ اگر اس جگہ ”معرکہ آرا“ کہا جائے گا تو اس کا مطلب اس سے مختلف ہو گا۔

○ ایک مرکب ”جیب و گریباں“ کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کی ترکیب کو سمجھ لینا چاہیے، تاکہ غلطی نہ ہو۔

”جیب“ اور ”جیب“ دو مختلف لفظ ہیں۔ ”جیب“ موٹا ہے، جو مثلاً اس شعر میں آیا ہے :

ہم نہیں آتے اس قریب میں ہیں

تم سے سو ایسے میری جیب میں ہیں

یہی ”جیب“ کبھی کبھی کٹ بھی جایا کرتی ہے۔ اسی سے ”جیب کتر“ بنا ہے۔ ”جیب“ دوسرا لفظ ہے۔ اس میں جیم پر زبیر ہے اور یہ معرکہ ہے، جو مثلاً مرزا قاسم کے اس شعر میں آیا ہے :

تھی صبح یا وہ چرخ کا جیب دریدہ تھا

یا چہرہ مسیح کا رنگ پریدہ تھا

یا مثلاً مرزا غالب کا یہ شعر :

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پرہیز

ہمارے جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

یا جیسے غالب ہی کا یہ شعر :

دیوانگی سے دوش پہ زنا رکھی نہیں

یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں

”جیب“ کے معنی ہیں : گریباں۔ اس لحاظ سے ”جیب و دامن“، صریح مرکب ہے۔ اس کے معنی ہوئے : دامن اور گریباں۔ اس کے برخلاف ”جیب

و گریباں“ صریح مرکب نہیں کیوں کہ دونوں لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں۔

”جیب و گریباں“ کے معنی ہوئے : گریباں گریباں۔ ان دونوں لفظوں

”جیب“ اور ”جیب“ میں امتیاز کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر یہ بات ذہن

میں نہیں ہوگی تو عین ممکن ہے کہ غالب کے شعروں میں ”جیب“ کو ”جیب“

پڑھا جائے (ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے) اور مصرعے کو بے معنی بنا دیا جائے۔

○ ایک مرکب ہے ”خط و خال“، اسے ”خط و خال“ بھی لکھا گیا ہے۔ یہاں بھی وہی بات ہے ”خط“ اور ”خال“ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں : تِل۔ ”خط و خال“، لکھنا چاہیے۔



صفت کے تین درجے ہیں : اچھا، بہت اچھا، سب سے اچھا۔ ان میں سے ہر کلمہ یا معنی ہے ؛ لیکن ہم اُسے بے جگہ استعمال کریں گے تو بے معنی بن جائے گا۔ کسی معمولی دست کار کے لیے کہا جائے کہ وہ تو بہت اچھا کاریگر ہے، تو یہ بے جا صرف ہوا۔ اُسی کے لیے اگر کہا جائے کہ وہ بہترین کاریگر ہے، تو یہ پہلے سے بھی بڑھ کر غیر مناسب صرف ہوا۔ بہترین، کا وہی مفہوم ہے جو ”سب سے اچھا“ کا ہے۔

یاد رکھیے کہ ہر اسم صفت ایک بیان ہے۔ جب ہم کوئی اسم صفت جملے میں لکھتے ہیں، تو گویا ہم ایک بیان دیتے ہیں جس کی پوری ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ معمولی جملے کے لیے یہ کہنا کہ عظیم الشان جلسہ تھا، غلط بیان دینے کے برابر ہے۔ معمولی شاعر کے لیے یہ کہنا کہ وہ بہت اچھا شاعر ہے، یا یہ کہنا کہ وہ صاحب طرز شاعر ہے، جھوٹی گواہی دینے کے ہم معنی ہے۔

اسم صفت بہت سے ہیں، جیسے : اچھا، بُرا، اعلیٰ، ادنا، بے مثال، بے نظیر، عظیم الشان (وغیرہ)۔ یہ تحریر میں آتے رہتے ہیں اور گفت گو میں بھی شامل ہوئے ہیں۔ ہم ان کو غیر مناسب طور پر استعمال میں لائیں گے، تو اس سے

دو بڑے نقصان ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ ان لفظوں کا مفہوم بگڑ کر رہ جائے گا۔

دوسرے یہ کہ ہماری تحریر میں خرابی پیدا ہو جائے گی اور ہم غلط بیانی کے مجرم

قرار پائیں گے۔ اگر ہم صفاتی لفظوں کو غیر مناسب طور پر استعمال کرنے کے

عادی بن جائیں گے، تو دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے

جھوٹ بولنے کی عادت ڈال لی ہے۔ یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ جھوٹے کی بات اعتدال کے قابل نہیں رہتی۔

شاعروں کو جو بہت سی آڑیاں حاصل ہیں، ان میں مبالغہ بھی شامل ہے؛ لیکن نشر تکلف والا ان کی راہ پر نہیں چل سکتا۔ نشر کے آداب شاعری کے سلمہ طور طریقوں سے مختلف ہیں۔ شاعر اس صفت کو جس طرح استعمال کر لیتا ہے، نشر تکلف والا اس آزادی اور آسانی کے ساتھ ان سے کام نہیں لے سکتا۔ نشر نگار اور شاعر دو الگ الگ راہوں کے راہی ہوتے ہیں۔

”بہتر“ اس صفت ہے اور یہ صفت کا دوسرا درجہ ہے۔ درجوں کی ترتیب یہ ہے: یہ، بہتر، بہترین۔ اسی ترتیب کے ساتھ ان کے معنی ہیں: اچھا، بہت اچھا، سب سے اچھا۔ ”بہتر“ مرکب لفظ ہے۔ ”یہ“ اور ”تر“ سے مل کر بنا ہے۔ ”یہ“ کے معنی ہیں: اچھا ”تر“ کے معنی ہیں: زیادہ۔ اس طرح ”بہتر“ کے معنی ہوئے: زیادہ اچھا یا بہت اچھا۔ اس جملے کو دیکھیے: ”وہ کلام زیادہ بہتر ہے“۔ ظاہر ہے کہ معنی کے لحاظ سے ”زیادہ“ قائلو ٹھہرے گا۔ ”بہتر“ کے تو خود ہی معنی ہیں: زیادہ اچھا۔

خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ جب کسی اسم کے ساتھ ”بہتر“ لایا جائے، تو پھر اس کے ساتھ ”زیادہ“ جیسے لفظ نہ لکھے جائیں۔ مثال کے طور پر اس جملے کو دیکھیے: ”زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس کلام کو کیا ہی نہ جائے۔“ اس میں ”زیادہ“ کی ضرورت نہیں، یوں کہ ”بہتر“ کے معنی ہیں: زیادہ اچھا۔ ایک اور جملہ: ”آپ کا یہ افسانہ، پہلے افسانے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔“ اس جملے میں ”بہت“، ”زیادہ“ کے مقابلے میں اور ”زیادہ“، ان دونوں لفظوں کو ایسے لفظوں کے ساتھ نہیں لانا چاہیے جن کے آخر میں ”تر“ ہو۔ مثلاً ایسے جملے نہیں لکھنا چاہیے: بہت بدتر ہے۔ بہت بہتر ہے، زیادہ بہتر ہے، بہت کم تر ہے۔

کم تر، بیش تر، بدتر، خوب تر، ان سب مرکب لفظوں میں ”تر“،

یہ طور لاحقے کے آداب اور اس کے معنی ہیں: زیادہ۔ اس طرح ”کم تر“ کے معنی ہیں: بہت کم۔ بیش تر، اس کے معنی ہیں: بہت زیادہ۔ ”بدتر“ کے معنی ہیں: بہت بُرا یا زیادہ بُرا۔ اسی طرح ”خوب تر“ کے معنی ہوئے: زیادہ اچھا یا بہت اچھا۔ مولانا حالی کے اس مصرعے سے اس مرکب کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکے گا:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

خوب سے خوب تر: اچھے سے اچھا، بہت اچھا، زیادہ اچھا۔ اگر کوئی شخص کہے کہ ”وہ فلم تو بہت خوب تر ہے“، تو آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ ”بہت خوب تر“ ٹھیک نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ ”یہ کام بہت بہتر ہے“، تب بھی آپ کے ذہن میں یہی خیال آنا چاہیے کہ یہ ٹھیک نہیں۔ ”بہت خوب تر“، ”بہت بہتر“، ”دو لڑکیاں“، ”بہت“، ”زیادہ“۔ ہاں، ”بہت کم“، ”بہت خوب“، ”بہت زیادہ“، ”بہت بُرا“، ”بہت اچھا“، جیسے ٹکڑے بالکل صحیح ہیں، کیوں کہ ان میں ”بہت“، ”زیادہ“ نہیں۔ ”بہت بُرا“ ٹھیک ہے، مگر ”بہت بدتر“ درست نہیں، یوں درست نہیں کہ ”بدتر“ میں خود ”تر“ کے معنی ہیں: بہت۔ پھر اس کے ساتھ ”بہت“، ”کم“، ”زیادہ“ لکھنا ہے۔



جملہ معترضہ کو تو سین میں نکھاجاتا ہے۔ جملہ معترضہ ایسے جملے یا عبارت کو کہتے ہیں جو اصل بات کا لازمی حصہ تو نہ ہو، مگر اسے کسی طرح کی ایسی نسبت حاصل ہو کہ لکھنے والے کی رائے میں اس کا بھی نکھاجانا ضروری سا ہو۔ مثال کے طور پر: مرزا صاحب نے (جن سے آپ مل چکے ہیں) کہلا بھیجا ہے کہ میں کل آؤں گا۔ جن سے آپ مل چکے ہیں، ”جملہ معترضہ“ ہے۔ یہ اصل بات کا حصہ تو نہیں، مگر لکھنے والے کے خیال میں اس کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ جملہ معترضہ اگر عبارت میں شامل ہو تو اس کا لحاظ رکھا جائے کہ عبارت بے ربط نہ ہونے پائے۔ مثال کے طور پر اسی جملے کو اس طرح لکھ کر دیکھیے: "مرزا صاحب دجن سے آپ مل چکے ہیں" نے کہلا بھیجا ہے کہ میں کل آؤں گا۔ اس جملے میں بے ربطی کا عیب موجود ہے۔ عیب یہ ہے کہ "نے" بے جگہ آیا ہے۔ اس جملے کو دیکھیے: "محمد حسین خاں صاحب دجن سے بھائی نکھو میں تمیل دار ہیں" کو میں ابھی تک خط نہیں لکھ سکا۔ یہاں بھی بے ربطی کا عیب موجود ہے۔ اس میں "کو" بے جگہ آیا ہے۔ یوں نکھنا چاہیے تھا: محمد حسین خاں صاحب کو دجن کے بھائی نکھو میں تمیل دار ہیں ابھی تک خط نہیں لکھ سکا۔

بے ربطی کا عیب کئی صورتوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ سب کی مثالیں دینا مشکل ہے۔ خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ جب بھی عبارت میں جملہ معترضہ کے طور پر کوئی جملہ یا عبارت آئے، تو دیکھ لیا جائے کہ نہ سین سے پہلے اور تو سین کے بعد کی عبارت میں کسی طرف کی بے ربطی تو پیدا نہیں ہوئی۔ جس لفظ کو یہ لفظوں کو پہلے قوس سے پہلے آنا ہے، وہ دوسرے قوس کے بعد تو نہیں آئے۔ اوپر کے دونوں جملوں کو مثال کے طور پر سامنے رکھا جاسکتا ہے۔ پہلے جملے میں "نے" اور دوسرے جملے میں "کو" کی صحیح جگہ تو سین سے پہلے ہے۔ جب ان کو تو سین کے بعد لکھا جائے گا تو کہاجائے گا کہ عبارت میں تعقید پیدا ہو گئی ہے۔ تعقید کا مطلب یہ ہے کہ ادائے مطلب کے لحاظ سے جملے میں کسی لفظ کو جہاں آنا چاہیے تھا وہ اس جگہ سے ہٹ کر آیا ہے۔ اسے عیب مانا جاتا ہے۔ تعقید سے اس خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ روانی ختم ہو جاتی ہے اور بیان کا حسن مائل پڑ جاتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے ایک اور مثال۔ ہمارے ایک مشہور ادیب نے لکھا ہے: "رفتہ رفتہ غالب کے مولوی سراج الدین احمد سے تعلقات میں گہرائی پیدا ہو گئی۔" اس جملے کو دو تین بار پڑھیے۔ آپ خود

محسوس کریں گے کہ پہلے ٹکڑے میں "کے" بے جگہ آیا ہے اور "سے" بھی عبارت میں کھپا نہیں، لکھو: "اکھڑا سا لگتا ہے۔ اس جملے کو اس طرح لکھ کر دیکھیے: رفتہ رفتہ غالب اور مولوی سراج الدین احمد کے تعلقات میں گہرائی پیدا ہو گئی۔" اب بات صاف ہو گئی۔ اس جملے میں "کے" بے جگہ آیا تھا اور "سے" زائد تھا۔ ان دونوں نے مل کر عبارت کی خوبی کو دھندلا دیا تھا۔ تعقید کا عیب پیدا ہوا، جس نے روانی پر بڑا اثر ڈالا اور ایک زائد لفظ نے بندش کی جستی کو نقصان پہنچایا۔ جب "کے" صحیح جگہ آیا، وہ عیب جاتا رہا اور "سے" جو زائد تھا، وہ اپنے آپ نکل گیا۔

اس سے ظاہر یہ بات معلوم ہوئی کہ جب بھی کوئی جملہ لکھا جائے تو یہ دیکھ لیا جائے کہ اس میں کوئی لفظ ادائے مطلب کے لحاظ سے بے جگہ تو نہیں ہے۔ یہ دیکھ لیا جائے کہ زائد لفظ تو عبارت میں شامل نہیں ہو گیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عبارت میں تعقید کا عیب پیدا ہو جائے، تو وہ عبارت اپنا حسن کھو دیتی ہے۔



روزمرہ اور محاورہ، ان دونوں کا ذکر شروع میں آچکا ہے۔ یہ لکھا جا چکا ہے کہ گفتگو اور تحریر، دونوں کو روزمرہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ جیسے "پانی پینا"، روزمرہ ہے، یعنی اردو والے "پانی پینا" کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس کی جگہ "آب پینا" کہے، تو اسے روزمرہ کے خلاف کہا جائے گا۔ "پانی" اور "آب" دونوں کے معنی ایک ہیں "آب پینا" کے معنی "پانی پینا" ہوئے۔ پھر بھی اسے درست نہیں کہا جائے گا۔ وجہ یہی ہوگی کہ اردو والے "پانی پینا" کہتے ہیں، "آب پینا" نہیں کہتے۔ روزمرہ کی تعریف لکھی جا چکی ہے، یعنی اس طرح نکھنا اور بولنا، جس طرح معیاری اردو میں لکھتے اور بولتے ہیں۔

روزمرہ کی طرح محاورے کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔ محاورے

میں مجازی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک محاورہ ہے "ناک کٹنا"۔ اس کے معنی ہیں: کسی کے آگے ذلیل و خوار ہونا، سبکی ہونا۔ یہ مجازی معنی ہیں۔ اگر کسی کی ناک پیچ ترش گئی ہو اور کہا جائے کہ اس کی ناک کٹ گئی، تو اس صورت میں اسے محاورہ نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ یہ حقیقی معنی ہیں۔ "ناک" سے پیچ پیچ کی ناک مراد لی جائے، تو یہ حقیقی معنی ہوں گے۔ اگر "ناک" سے "عزت و آبرو" مراد لی جائے تو یہ مجازی معنی ہوں گے۔

خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ محاورے کو اسی طرح استعمال کیا جائے جس طرح وہ مستعمل رہا ہے۔ اس میں کسی طرح کی تبدیلی نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جس جگہ محاورے کو (یا کسی خاص مرکب کو) استعمال کیا جائے، تو یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ معنیٰ مطلوب کے لحاظ سے یہاں ایسا کوئی پہلو تو پیدا نہیں ہو جائے گا جو کھٹنے والے یا بولنے والے کے اصل مفہوم سے مختلف ہو۔ اگر سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ یاد آگیا۔

میرزا ناصر علی دہلوی اپنے زمانے کے بہت مشہور ادیب تھے۔ ان کا رسالہ صلوات عام آج تک اپنے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ میر صاحب کی نشر اور ان کی زبان دانی کی اس زمانے میں دھوم تھی۔ دہلی کے مشہور ادیب شاہد احمد دہلوی (مرحوم) نے میر صاحب کا خاکہ لکھا تھا، جو ان کے مجموعہ مضامین گنجینہ گوہر میں شامل ہے۔ اس میں کئی دل چسپ واقعات لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ آپ سن لیجیے۔ منظر یہ ہے کہ ایک صاحب ملنے کے لیے آئے ہیں اور بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ باقی واقعہ شاہد صاحب کے الفاظ ہیں:

"عقیدت مند نے بڑی لجاجت سے کہا: آپ کو زحمت دینے کی معافی مانگتا ہوں۔"

میر صاحب تنگ کر بولے: "میاں صاحب زادے! معافی کیا مانگتے ہو، بمعیک مانگو بمعیک۔ وہ بچارے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے غلط

اردو میں کر میر صاحب آپ سے باہر ہو جاتے تھے،

مطلب یہ ہے کہ ان صاحب کو کہنا چاہیے تھا کہ "معافی چاہتا ہوں"۔ معافی چاہنا اور معافی مانگنا، اپنی اپنی جگہ دونوں با معنی ہیں، لیکن دونوں کے استعمال کے موقعے الگ الگ ہیں۔ کسی شخص نے کوئی ایسی بات کہی جو نہیں کہنا چاہیے تھی، یا کوئی ایسا کام کیا جو مناسب نہیں تھا، ایسے موقعوں پر بہتر کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ معذرت کی جائے اور کہا جائے: "معافی چاہتا ہوں"۔ یعنی ایک جذبات آدمی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس نے غلطی کا اعتراف کیا اور تیز داری کے آداب کے ساتھ معذرت کی۔

دوسری صورت اس سے مختلف ہے۔ ذرا دیر کے لیے مان لیجیے کہ ایک صاحب کسی سیاسی ایکٹیویشن میں شامل ہو کر جیل چلے گئے۔ جیل کی سختیوں سے گھبرا کر یا کسی اور وجہ سے صلح سمجھوتے پر اتر آئے اور معافی نامے پر دستخط کر کے جیل سے باہر آ گئے۔ ایسے صاحب کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ تو معافی مانگ کر چلے آئے، انھوں نے معافی مانگ لی۔ یہ تو آپ مانیں گے کہ اس میں بُرائی کا پہلو جھٹک رہا ہے۔ یہاں معافی مانگنے اور بمعیک مانگنے میں کچھ فرق نہیں رہا۔ "معافی مانگنا" میں کبھی بُرائی کا اور کبھی طنز کا مفہوم شامل ہوتا ہے، اس پر نظر رکھنا چاہیے۔

○ ایک صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا تھا: "ایک بے نام سی کسک اس کے سینے میں نہیں مارتی تھی"۔ اتفاق یہ ہوا کہ ایک جلسے میں انھوں نے یہ مضمون پڑھا۔ کئی سنسنے والوں نے سر محفل کہا کہ: "طیس مارنا، درست نہیں۔ اعتراض صحیح تھا۔ بچارے کو بھری محفل میں شرمندہ ہونا پڑا۔"

میر انیس کا مشہور شعر ہے:

کھا کھلے اوس اور بھی سبز ہرا ہوا

تھا موتیوں سے دامن صحران بھر ہوا

مولانا شبلی نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ اس شعر میں "اوس" کی جگہ

”شبیم“ نکھا جائے، تو شعر کی فصاحت ختم ہو جائے گی۔ مشہور استاد اور زبان داں آرزو نکھنوی نے اپنی کتاب نظام اردو میں اس شعر سے متعلق یہ وضاحت کی ہے کہ یہاں ”شبیم“ اس لیے بے محل ہو گا کہ محاورہ ہے ”اوس کھانا“۔ ”شبیم کھانا“ محاورہ نہیں۔ میرا نیس تو زبان، روزمرہ اور محاورے کی نراکتوں سے خوب واقف تھے، اسی لیے انھوں نے ”کھا کھلے شبیم“ نہیں لکھا۔

○ — ایک بڑے ادیب نے لکھا ہے: ”انھوں نے اول درجے میں بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا تھا۔“ اس جملے میں روزمرہ کی غلطی ہے۔ روزمرہ ہے: امتحان میں کامیاب ہونا۔ امتحان کا میاب کرنا، روزمرہ نہیں۔

○ — بعض لوگ ”استفادہ حاصل کرنا“ کہتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ ”استفادہ کرنا“ متعلل ہے۔ مثلاً: انھوں نے مغربی علوم حاصل کیے تھے اور مشرقی علوم کے باہرین سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اگر یہاں ”استفادہ حاصل کیا تھا“ لکھا جائے، تو جملہ غلط ہو جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ ”استفادہ“ میں حاصل کرنے کا مفہوم شامل ہے۔ ”استفادہ حاصل کیا“ میں لفظ ”حاصل“ زائد ہے، اسی لیے ”استفادہ کرنا“ صحیح ہے اور ”استفادہ حاصل کرنا“ درست نہیں۔

○ — سید مسعود حسن رنوی (مرحوم) مشہور ادیب اور زبان داں تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ایک مضمون میں مرحوم کا ایک واقعہ لکھا ہے: ”جملوں میں لفظوں کا صحیح دروبست اور ہر لفظ کی معنوی پرتو پر نظر، ان کی تحریر اور گفتگو، دونوں کا وصف ہے۔ ایک بار جو شش ملیح آبادی نے، جو خود زبان داں تھے اور لفظ لفظ کی صحت کا خیال رکھتے تھے، اپنی مشہور نظم پڑھی جس کا ٹیپ کا مصرع تھا:

رواں دواں بڑھے چلو، رواں دواں بڑھے چلو

دواں سے چلتیں اڑ گئیں۔ جلسے کے بعد چائے پر مسعود صاحب نے خوش ملیح آبادی کو الگ بلا کر، بڑی نرمی اور شائستگی سے کہا: ”جو شش صاحب! جب یہ نظم شائع کریں تو یہ نوٹ ضرور دے دیجیے گا کہ ”رواں دواں“، یہاں لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، محاورے کے اعتبار سے نہیں۔

جو شش صاحب چونکا ہو گئے، بولے: ”اور محاورے میں اس کا کیا مفہوم ہے؟“ مسعود صاحب نے بتایا ”رواں دواں“ کا محاورے کے اعتبار سے وہ مفہوم ہے جو صفتی لکھنوی نے یتیموں کے بارے میں اپنی نظم میں ادا کیا ہے:

رواں دواں ہیں، غریب الدیار ہیں ہم لوگ

رواں دواں، یعنی مارے مارے پھرنے والے، بے سہارا“

(غالب نامہ، مسعود حسن رنوی زیر)

اس لفظ ”رواں دواں“ کا یہ معنی پہلو جو شش صاحب کی نظر میں نہیں تھا، یوں وہ اس طرح لکھ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معنوی خرابی کا پہلو نکل آیا اور اس طرح مفہوم بگڑ گیا۔ انھوں نے کہنا یہ چاہا تھا کہ زور شور اور عزم و ارادے کے ساتھ آگے بڑھے چلو۔ مگر اس میں یہ پہلو پیدا ہو گیا کہ مارے مارے پھرنے والے بے سہارا لوگوں کی طرح چلتے رہو۔

○ — ایک مشہور لکھنے والے نے ایک صاحب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: ”بوڑھے ہو چکے ہیں، بیمار رہتے ہیں، پھر بھی روزانہ لائبریری جاتے ہیں۔ سچ ہے، چور چوری سے جاتے، ہیرا پھیری سے کیا جائے۔ کیسی بڑی غلطی ہوئی کہ تعریف کے بجائے بُرائی نکل آئی۔ یہ مثل ”چور چوری سے جاتے“۔ تعریف کے موقع پر استعمال میں نہیں آتی۔ کسی کی بُرائی کرنا ہو، تب لکھتے ہیں۔

○ — اردو زبان کی جو خوبیاں بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ باتوں میں سلیقے اور تمیز کی روشنی شامل ہوتی ہے۔

اگر یہ بات درست ہے اور آپ کو بھی اس سے اتفاق ہے تو ذرا دیر کے لیے اس طرف توجہ کیجیے۔ ایک عزیز دوست آپ سے ملنے کے لیے آتے ہیں۔ آپ ان کی خاطر تواضع کرتے ہیں، ادب و ادب کے ساتھ پیش آتے ہیں اور خوش سلیقگی کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ جب وہ چلنے لگتے ہیں تو ادب و مہمان نوازی کے مطابق آپ کچھ دور تک ان کے ساتھ چلتے ہیں اور بہت خلوص کے ساتھ کہتے ہیں: آئیے میں آپ کو بس اسٹینڈ تک چھوڑ آؤں۔ آپ ذرا سی توجہ سے کام لیں تو خود محسوس کریں گے کہ بے خیالی میں ایک غیر مناسب جملہ آپ کے منہ سے نکل گیا۔ بات یہ ہے کہ کچھ جملوں میں روزِ مہرہ کے لحاظ سے "چھوڑنا" اچھے مفہوم میں استعمال نہیں کیا جاتا، ترکِ تعلّق کا مفہوم نکلتا ہے۔ یہ جملہ بھی اسی انداز کا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: فلاں شخص نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا۔ یا جیسے ایک بلی بہت پریشان کرنے لگی۔ کبھی دودھ پی گئی، کبھی گوشت کھالیا۔ کسی ترکیب سے اُس کو پکڑ لیا۔ بوری میں یا بڑے تھیلے میں بند کر دیا اور کہا: جاؤ اسے دریا پار چھوڑ آؤ۔ تو یہ ہے چھوڑ آنے کا مفہوم۔ اب آپ ہی غور کیجیے کہ آپ کی بات کیسی بگڑی! آپ کہنا تو یہ چاہتے تھے کہ میں بس اسٹینڈ تک ساتھ چلوں گا، اور مطلب یہ ہو گیا کہ آپ ان صاحب کو (بلی کی طرح) چھوڑنے جارہے ہیں۔ ایسے جملے سننے میں آجایا کرتے ہیں: میں اپنے کو اسکول چھوڑنے جا رہا ہوں۔ میں ان کو اسٹیشن چھوڑنے جاؤں گا (وغیرہ)۔ یہ غیر مناسب اندازِ بیان ہے۔ آسانی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بس اسٹینڈ تک آپ کے ساتھ چلوں گا، یا میں وہاں تک آپ کا ساتھ دوں گا۔ اور بھی مناسب اندازِ بیان ہو سکتے ہیں۔ غیر مناسب اور بات کو بگاڑنے والا اندازِ بیان اختیار کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ خیال رکھیے کہ نہ آپ کی زبان خراب ہو اور نہ اردو زبان بگڑنے پائے۔

○ روزِ مہرہ اور محاورے کی طرح جملے میں فعل کو بھی صحیح صورت میں آنا چاہیے۔ کوئی صاحب کہیں کہ "یہاں برسوں بہت بڑا جلسہ

ہونے جا رہا ہے" تو اس پر ٹوک دینا چاہیے۔ یہ کہا جاسکتا تھا کہ برسوں یہاں بہت بڑا جلسہ ہوگا۔ یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ برسوں یہاں بہت بڑا جلسہ ہونے والا ہے۔ "ہونے جا رہا ہے" تو نرا انگریزی کا ترجمہ ہے ایسا ترجمہ جو اردو زبان کے مزاج اور اس زبان کے اندازِ بیان سے میل نہیں کھاتا۔

ذرا دیر کے لیے مان لیجیے کہ آپ کا نام محمود ہے۔ آپ سے کہا گیا کہ بازار سے سودا لے آئیے۔ آپ چل دیے یا چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس صورت میں اگر یہ کہا جائے کہ محمود سودا لینے بازار جا رہے ہیں، تو یہ جملہ بالکل درست ہوگا۔ یوں درست ہوگا کہ آپ واقعی بازار جا رہے ہیں۔

جار رہا ہے، کر رہا ہے، لکھ رہا ہے، ہو رہا ہے (وغیرہ) فعلِ حال کی یہ سب صورتیں کام کے جاری ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر کسی علاقے میں ایک اسکول بنائے جانے کا پروگرام ہے، اُس کے لیے یہ کہا جائے کہ "اسکول بننے جا رہا ہے"، تو یہ صحیح اندازِ بیان نہیں ہوگا۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ایک اسکول بنے گا، یہاں ایک اسکول بنایا جائے گا (وغیرہ)۔ مختصر یہ کہ "ہونے جا رہا ہے"، جیسے شکروں کے استعمال میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں تھوڑی سی وضاحت غیر مناسب نہ ہوگی۔ جارہا ہے کر رہا ہے (وغیرہ) فعلِ حال کی شکلیں ہیں۔ ان کے استعمال میں عام طور پر غلطی نہیں ہوتی۔ ان شکلوں کو عام طور پر زمانہ حال کے لیے اور خاص صورتوں میں زمانہ مستقبل کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں، جیسے: میں پرسوں وہلی جا رہا ہوں (یعنی جاؤں گا)۔ گڑ بڑ اس وقت ہوتی ہے جب ان سے پہلے کوئی اور ٹکڑا بھی ہوتا ہے، جیسے: کرنے جا رہا ہوں، لالے جا رہا ہے، لکھنے جا رہا ہے، ہونے جا رہا ہے۔ (وغیرہ) ایسی صورتوں میں، یعنی جب فعلِ حال سے پہلے مصدرِ مخرب صورت میں آئے (یعنی: لالے، کرنے، ہونے

تلفظ

املا اور انشا دونوں کا تعلق رکھنے سے ہے۔ یہ ٹھیک ہے، مگر جو کچھ لکھا گیا ہے، اسے پڑھا بھی جائے گا، یوں تلفظ بھی اس عمل کا ضروری حصہ بن جاتا ہے۔ جس طرح غلط املا پر اعتراض کیا جائے گا، اسی طرح غلط تلفظ پر بھی نوک کا جائے گا۔ لفظوں کا صحیح تلفظ نہ معلوم ہو تو بار بار شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ سبق پڑھنے یا پڑھانے کے دوران کسی لفظ کو صحیح طور پر نہیں پڑھا، تو دوسرے بچوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ کوئی مضمون پڑھا کر دیکھا جائے گا، اس کی ایک لفظ کا تلفظ بھی غلط ہو گیا تو پڑی رسوائی ہوگی۔ اس لیے اس لیے کہ اچھے طالب علم لفظوں کو صحیح طور پر یاد کریں گے۔ ہم اپنے بچے کو غلط کر کے پڑھیں، یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

مثال کے طور پر ایک لفظ "گذشتہ" کو لیجیے۔ اسے "گزشتہ" لکھا گیا تو یہ املا کی غلطی ہوگی۔ لکھا تو صحیح طور پر "گذشتہ" (ذال کے ساتھ) لیکن جب پڑھنے کھڑے ہوئے تو "گذشتہ" پڑھا (ذال کے نیچے زبر) یہاں لکھا وٹ صحیح رہی، تلفظ غلط ہو گیا۔ اس لفظ کا صحیح تلفظ "گذشتہ" ہے۔ (گاف پر پیش، ذال پر زبر)۔ کاغذ پر لفظ صحیح طور پر لکھا ہوا ہے، مگر وہ کاغذ تو آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے، سننے والے تو آپ کی زبان سے غلط تلفظ سن رہے ہیں۔

۴۷
وغیرہ کا اضافہ ہو تب انہیں فعل مستقبل کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً: گھنٹا بھر بعد جلسہ ہونے والا ہو، تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ جلسہ ہونے جا رہا ہے۔

ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن یہاں گنجائش نہیں۔ بس یہ بات ذہن میں بٹھانا ہے کہ جب ہم کچھ لکھیں، یا کچھ کہیں، تو یہ ضرور دیکھ لیں کہ اس میں کوئی غلطی، کسی طرح کی خرابی یا برائی تو نہیں۔ احتیاط کی عادت پڑ جائے تو پھر ذہن بھی اپنا کام کرتا رہتا ہے اور نظر بھی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

لفظ کا صحیح اطلاق معلوم ہو، یہ ضروری ہے۔ یہ بھی اُسی قدر ضروری ہے کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ بھی معلوم ہو۔ سبق پڑھتے ہوئے اگر ”توجہ“ کہا گیا تو ٹوکا جائے گا۔ کہا جائے گا کہ ”توجہ“ کہنا چاہیے۔ علماء، اُدباء، طلبہ سمجھا جائے، تب بھی ٹوکا جائے گا۔ یوں کہ ان کا صحیح تلفظ علماء، اُدباء، اور طلبہ ہے۔

زیادہ مشکل اُن لفظوں میں پیش آتی ہے جن میں تلفظ کی تبدیلی سے معنی بدل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ ”مجاز“ کو بھیجیے۔ اسے ”مجاز“ (میم کے ذریعہ کے ساتھ) پڑھا جائے تو یہ حقیقت کا متضاد ہوگا۔ اقبال کے اس شعر میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے :

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آبا س مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اب اس جملے کو دیکھیے : ”ہم نے اُن کو مجاز کر دیا ہے کہ وہ ہماری طرف سے یہ کام کریں گے۔“ اس جملے میں بھی ”مجاز“ کیا ہے، مگر یہاں یہ دوسرے لفظ کے طور پر آیا ہے۔ اس کا تلفظ ”مجاز“ (میم کے پیش کے ساتھ) ہے۔ اس کے معنی ہیں : اجازت رکھنے والا جس کو اجازت دی گئی ہو۔ اگر اس جملے میں ”مجاز“ پڑھا جائے گا تو مفہوم خبط ہو جائے گا۔ مناسب یہ ہوا کہ ”مجاز“ اور ”مجاز“ دو الگ الگ لفظ ہیں۔ اطلاق ایک ہے، تلفظ مختلف ہے اور اسی نسبت سے معنی بھی الگ الگ ہیں۔

”شہید“ کی جمع ”شہداء“ ہے (شہین پر پیش، قہ پر زبر)۔ جیسے شہداء کر بلا۔ ایک اور لفظ ہے ”شہدا“ (شہین پر پیش، قہ ساکن)۔ یہ آواز، بدکردار جیسے مفہوم میں آتا ہے (پہلے اس کے کچھ اور معنی تھے)۔ اگر ”شہدا“ کو ”شہدا“ کہا جائے تو مفہوم پر کیا گزر جائے گی ؟

”فاضل“ کی جمع ”فضلا“ ہے (قہ پر پیش، قہ پر زبر)۔ ایک اور لفظ ہے ”فضلہ“ (جیسے : سارا فضلہ خارج ہو گیا)۔ اطلاق مختلف ہے، تلفظ ایک ہے۔ ”فضلہ“ کو اگر ”فضلا“ پڑھا جائے گا تو پھر یہ لفظ تلفظ

میں آکر ”فضلہ“ بن جائے گا۔ آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ یہ کچھ اچھی بات نہیں ہوگی۔

ہم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ صحیح تلفظ مرض ہے یا مرض، خلق ہے یا خلق، غرق ہے یا غرق، غطر ہے کہ غطر، ورق ہے کہ ورق (دو غیرہ)۔ جب ہم مرض، ورق، غرق، خلق، غطر کہیں گے، تب سمجھا جائے گا کہ ہمیں ان لفظوں کا تلفظ معلوم ہے۔

ایک لفظ ہے ”شادی مرگ“۔ اصل میں ”مرگ شادی“ تھا۔ اضافت مقلوب نے اسے ”شادی مرگ“ بنا دیا۔ اسے ”شادی مرگ“ کہا جائے تو تلفظ غلط ہو جائے گا۔ یا جیسے ”پس منظر“ کو ”پس منظر“ کہا جائے تب بھی یہی کہا جائے گا کہ تلفظ غلط ہو گیا۔ یا جیسے ”سرور قی“ اور ”سرور قی“ دو مختلف لفظ ہیں۔ دونوں کے معنی الگ الگ ہیں۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ اس کتاب کا سرور قی خوب صورت ہے، تو مفہوم بگڑ جائے گا۔ یہاں ”سرور قی“ کہنا چاہیے تھا (اضافت کے بغیر)۔ ان لفظوں کو یہاں معنی بہ طور مثال لکھا گیا ہے۔ ان کی مفصل بحث اسی کتاب کے دوسرے حصے میں ”اضافت کا زبرد“ کے عنوان کے تحت ملے گی۔

مرزا غالب کا مشہور شعر ہے :

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ برگو میں

”تیز رو“ (ر کے پر زبر) کے معنی ہیں : تیز چلنے والا۔ فارسی کا ایک مصدر ہے ”رفتن“ اس کے معنی ہیں : چلنا۔ رفتار اسی سے بنا ہے۔ اسی سے ”رو“ بنا ہے اور اسی ”رو“ سے ”تیز رو“ بنا ہے۔

فارسی میں ایک اور مصدر ہے ”روئیدن“۔ اس کے معنی ہیں : اُگنا۔ ”روئید گی“ اسی سے بنا ہے۔ اس مصدر سے فعل امر ”رو“ بنتا ہے۔ اس سے ایک اسم فاعل ”خود رو“ بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں : اپنے آپ اُگنے والا۔

لالہ خود رو نہیں ہے، خون نے فرما دے
جوش میں اگر لگا دی کوہ کے دامن میں آگ

لالہ مشہور پھول ہے سرخ رنگ کا۔ اس کا اصلی وطن ایران ہے، جہاں
یہ پہاڑوں کے دامن میں کھلتا ہے۔ بے شمار پھول ہوتے ہیں۔ دوسرے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کے دامن میں آگ لگی ہوئی ہے، دکتے ہوئے
انگلارے بکھرے ہوئے ہیں۔ لالہ خود رو، کے معنی ہیں :
اپنے آپ آگ آنے والا لالہ۔ اسے اگر "لالہ خود رو" پڑھا جائے تو اس
کے معنی ہوں گے : اپنے آپ چلنے والا لالہ۔ مطلب چوہت ہو گیا نا! —
تیز رو : تیز چلنے والا۔ خود رو : اپنے آپ آگئے والا۔ یہ معنوی فرق نہ معلوم
ہو تو ظاہر ہے کہ "رو" کا تلفظ غلط ہو سکتا ہے۔ تلفظ غلط ہوا تو معنی
بدل جائیں گے، بل کہ یہ سمجھیں کہ بگڑ جائیں گے۔

فراق گورکھ پوری نے ایک نظم لکھی ہے جس میں ہمیں کا ذکر کیا ہے کہ پتہ کس
چیز کو کیا سمجھتا ہے۔ اسی نظم کا ایک ٹکڑا ہے :

سمجھ سکے کوئی اے کاش عبد طفلی کو

نمود لالہ خود رو میں دیکھنا جنت

کرے نظارہ کوئین اک گھر وندے میں

اس میں بھی "لالہ خود رو" (رے کے پیش کے ساتھ) ہے۔

میر تقی میر کا مشہور شعر ہے :

دلی کے منتھے کو چے، اوراقِ مصوّر تھے

جو شکل نظر آئی، تصویرِ نظر آئی

ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ "مُصَوِّر" اور "مُصَوَّر" دو مختلف لفظ ہیں۔
"مُصَوِّر" کے معنی ہیں : تصویر بنانے والا۔ یہ عربی کا اسم فاعل ہے۔
"مُصَوَّر" (واو کے زبر کے ساتھ) اسم مفعول ہے۔ معنی ہیں : وہ تصویر
جسے بنایا گیا ہے۔ "اوراقِ مُصَوَّر" کا مطلب ہے ایسے ورق جن پر تصویریں

بنی ہوئی ہیں۔ (مُرْتَبِع "ایسے ہی اوراق کے مجموعے کو کہتے ہیں)۔ شاعر نے
دلی کے گلی کوچوں کو "اوراقِ مُصَوَّر" کہا ہے اور ان دونوں کو یاد کیا ہے جب
دلی کی ہر گلی خوب صورت چہروں سے معمور تھی۔

فیض احمد فیض کی ایک مشہور نظم کا عنوان ہے : "آج بازار میں پایہ جولاں چلو"
نظم اس طرح شروع ہوتی ہے :

چشمِ غم، جانِ شوریدہ کافی نہیں

تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں

آج بازار میں پایہ جولاں چلو

"جولاں" (جیم پر پیش) کے معنی ہیں : ریڑی۔ "پایہ جولاں" کے معنی ہوں گے :
جس کے پیروں میں ریڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔

ایک اور لفظ ہے "جولانی" (جیم کے زبر کے ساتھ)۔ اسی سے "جولانی" بنتا ہے
اور اس سے "جولانی طبع" بنتا ہے جس کے معنی ہیں : طبیعت کی
روانی، اُمنگ۔ "جولاں" کے لفظی معنی ہیں : گھوڑا دوڑانا، کُڈانا۔

مطلب یہ ہوا کہ "جولاں" اور "جولاں" دو مختلف لفظ ہیں۔ فیض کی اس
نظم میں "پایہ جولاں" (جیم کے پیش کے ساتھ) آیا ہے۔ اسے اگر جیم کے
زبر کے ساتھ "پایہ جولاں" پڑھا جائے، تو مطلب بدل جائے گا۔ بدل
کیا جائے گا، بگڑ جائے گا۔

مرزا غالب کا مشہور شعر ہے :

چاکِ منتِ کر جیب بے ایامِ گل

پنکھ اُدھر کا بھی اسٹارا چاہیے

پہلے مصرعے میں ایک لفظ "جیب" آیا ہے۔ اس کی دو تفسیریں ہیں : جیبِ جیب۔
"جیب" کے معنی ہیں : پاکٹ، مثلاً : قیص کی جیب میں روپے ہیں۔
"جیب" کے معنی ہیں : گریبان، جسے شاعروں کی روایت کے مطابق
عاشقِ جوش میں اگر چاک کر دیا کرتا تھا۔ غالب کے اس شعر میں "جیب"

[illegible]

دوباره	دفعه (خوف)	دائرة	خسته
دوبالا	دفعتا	دائمه	ختم، خرم، خرمی
دوپقا	دفعه	داؤد	خرابا
دوپلی	دفعیه	دائیں بائیں	خریطہ
دوپلی	دفعینہ	دباؤ (حاصل مصدر)	خزف
دوپیاڑہ	دقیقہ	دباؤ (فعل)	خسارہ
دوچار	دوگنا - دوگنا	دیدہ	خستہ
دوورخا	دل آرا	دیدیھا	خمایازہ (انگڑائی، بدلا)
دور دورا	دل آرام	دوتا (جیسے ہرگز نہ)	پشیمانی
دورنگا	دل آویز	دووا	خواستگار
دورویہ	دلارا	دو دھی	خواجہ
دوسا	دولاسا	دوپے	خواہ مخواہ
دوسالہ	دولائی	درجہ	خواب تر
دوسوتی	دلایل	درخواست	خوش خط
دو شامہ	دل پذیر	درگزر کرنا	خوشنود - خوشنودی
دوشالہ	دل دادہ	درماہ	خوشہ
دوشنبہ	دل دار	دورہ (چمکے کا کڑا)	خوش (خوش و خوش)
دو طرفہ	دل داری	دورہ - ورہ (گھائی)	خواب (آبِ بخون)
دو غلا	دل ربا	دیربا	خویش
دو فصلی	دلستان	دیرپہ	خجیلا (دورزی)
دوگانہ	دل کش	دیریز (اکڑا)	خیر ستا
دوگونہ	دل کشا	دیربسی	داخلہ
دو محلا	دلن	دڑھیل	دورا
دو منزلہ	دلیا	دڑبڑا	داروغہ
دو گنہا	دنیہ	دساری	داعیہ
دونہ	دندانہ	دستانہ	دانا و قتل مند
دونہ	دوآبہ	دستہ	دانہ
دونسلہ	دوات	دسہرا	دانتا کل کل
دونوں	دوار	دعوا	دائو
دو ہشتہ	دوالا، دوالیا، دوالیہ	دعوی دار	داینا
دوہتی	دوآئی	دغدغہ چھوٹی فندیل، دیکھتا ہوا	دائسر

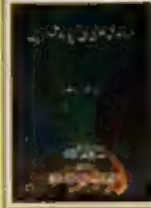
سُده بده	سُپولا	سُہائیک - سہائیک	سُتلا
سُراے	سُپولیا	سُتو	سُتر مگین
سُردہ (ایک پھل)	سُتیرا	سُیا، سِیہ، سِیین	سُشت (ساش)
سُسر کہ	سُسترا	سُیو	سُطرنج
سُسرگدشت	سُسخائی	سُتات	سُشکارا
سُریاہ - سُرملیہ	سُسخنا	سُتارہ	سُشکرانہ
سُریاہ دار	سُسخینا	سُیپارہ	سُشکرانا (سادہ چاولوں)
سُرمگین	سُندیسا	سُیدھا سادھا	سُشکر اور گھی ملا ہوا)
سُرمہ	سُکالی، سُسکنا،	سُپا (ایک دعوت)	سُشکرہ
سُرمی	سُکوانا، سُسکنا	سُیکڑا، سُسکڑ	سُشکر پارا
سُروا	سُیک -	سُیکڑوں	سُشکر خورا
سُروتا	سُسنہ	سُینا پس	سُشکر گزار
سُرهانا، سُرھانے	سُوا، سُوی، سُویان	سُینتس	سُشکرے - سُشکرے
سُفرہ	سُوارت	سُینٹھا	سُشوکا
سُفیدہ	سُوالے	سُیدور	سُشپتا (ٹاٹ کا پڑا)
سُقا	سُوتا (سُوت)	سُینر	سُشپلا
سُکتہ	سُوچنا		سُشیمبو
سُکورہ	سُور	سُاشا	سُشمن، سُشما
سُکتہ	سُول، سُولوں،	سُاشانہ	سُشمن البدا
سُلفا	سُولوں،	سُاذ	سُشوالا
سُودا سلف	سُولوں	سُاستر، سُستگیت	سُشورا (مجلس سُشول)
سُدا	سُوتیان	سُالا (پانچ سُالا)	سُشوربا
سُلیمان	سُودی پیر	سُامیانہ	سُشورہ بُشت
سُما (آسمان)	سُوڈ (پُرا)	سُائبہ	سُشدا (شہید کی جمع)
سُماں	سُود اتفاق	سُایہ	سُشہدا
سُمبھل	سُود ادب	سُایتہ - سُایشگی	سُشہرہ
سُمبھوتا	سُود ظن	سُایگان	سُشے
سُمن	سُود بہنم	سُشب خون	سُشینی خورا
سُمن (عمر)	سُومیر	سُشبہ - سُشبہ	سُشپرہ
سُموسا	سُہ (سُہنا کا فعل امر)	سُشتابا	سُشکیپیر
سُنداؤنی	سُہلے (درام سہاے)	سُشمنہ (کو توں)	سُشیوا (سُشیوا بیان)

سُشیوہ (طوطی، انداز)

عبادت گزار	سُضامت	سُضامیت	سُضامیت
عبد اللطیف	سُضیم	سُضیم	سُضیم
عجوب (عجوب)	سُضمر	سُضمر	سُضمر
عذار (عُرسار)	سُضمر غام (سُشیر)	سُضمر غام (سُشیر)	سُضمر غام (سُشیر)
عذرا	سُضمر و شتا	سُضمر و شتا	سُضمر و شتا
عذوبت	سُضمر ج	سُضمر ج	سُضمر ج
عظما	سُضمر (گم راہی)	سُضمر (گم راہی)	سُضمر (گم راہی)
عظیم (نام)	سُضیافت	سُضیافت	سُضیافت
عقبہ	سُضیاء اللہ	سُضیاء اللہ	سُضیاء اللہ
علاحدہ - علاحدگی	سُضیاء الدین	سُضیاء الدین	سُضیاء الدین
علاقہ جات	سُضیم (سُشیر)	سُضیم (سُشیر)	سُضیم (سُشیر)
علا الدین	سُضیف (بہان)	سُضیف (بہان)	سُضیف (بہان)
علی الشباح	سُضیق (رنگی)	سُضیق (رنگی)	سُضیق (رنگی)
علی العوم	سُطالب علم	سُطالب علم	سُطالب علم
علین (نام)	سُطائر	سُطائر	سُطائر
علی هذا القیاس	سُطیلہ	سُطیلہ	سُطیلہ
عمر (نام)	سُطرقہ العین	سُطرقہ العین	سُطرقہ العین
عمر (نام)	سُطلیہ	سُطلیہ	سُطلیہ
عیسا - عیسیٰ	سُططراق	سُططراق	سُططراق
عیسائی	سُططنہ	سُططنہ	سُططنہ
	سُطوبا	سُطوبا	سُطوبا
فارت گر - فارت گری	سُطوفا کر با	سُطوفا کر با	سُطوفا کر با
غازہ	سُطومار	سُطومار	سُطومار
غازی پور	سُطویلہ	سُطویلہ	سُطویلہ
غالیچہ	سُطیار (اڑنے والا)	سُطیار (اڑنے والا)	سُطیار (اڑنے والا)
غائب	سُطیارہ	سُطیارہ	سُطیارہ
غبارا	سُطیش	سُطیش	سُطیش
غیر نور	سُطیل (دسیہ)	سُطیل (دسیہ)	سُطیل (دسیہ)
غیا			
غیرا کرنا	سُطشورا	سُطشورا	سُطشورا
غیرا (ایک زمانہ پوک)	سُطاید	سُطاید	سُطاید
	سُطائے	سُطائے	سُطائے

فقیہ
فقیہ
غلیتہ۔ قیلہ
فن کار
غماش
فی الہدیم
غیتا
فیروزہ
قانیہ، قافیہ
قابل
قائم
قتلا
قدرت
قرأت۔ قرئت
قرطاس
قرمہ
قرنا
قریہ
قراق
قسائی
قشقہ
قصاب
قصاص
قصاص دقتہ کی
قظامہ
قفس
قلم کار
قلمیہ
قلمیہ
قمیص
قنات

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں



مصنف : عبدالقوی دستوی
صفحات : 184
قیمت : -/72 روپے

آزمائش کی گھڑی



مصنف : سید حامد
صفحات : 136
قیمت : -/60 روپے

مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست کل اور آج



ترتیب : مشیر الحق
صفحات : 36
قیمت : -/36 روپے

تعلیم اور اس کے وسائل



مصنف : محمد اکرام خاں
صفحات : 160
قیمت : -/65 روپے

انتخاب نظیر اکبر آبادی



مصنف : رشید حسن خاں
صفحات : 280
قیمت : -/77 روپے

مفکرین تعلیم



مصنف : محمد اکرام خاں
صفحات : 184
قیمت : -/72 روپے

تفہیم کیا ہے



مصنف : آل احمد سرور
صفحات : 200
قیمت : -/62 روپے

شریف زادہ



مصنف : مرزا رسوا
صفحات : 200
قیمت : -/62 روپے

ISBN: 978-81-7587-539-5



ہونٹ	ہر جا خرچا	ہتھ پھول	دکھڑیا
ہونٹ	ہر ج مرچ	ہتھ پھیری	ولائی
ہوا ہونی ہوئے	ہمالا	ہتھ پھٹ	
ہوا	ہم پائیہ ہم پائیہ	ہتھ نال	ہاتھ
ہوئے ڈریسر	ہم پائیہ	ہتھن	پاتھن
ہوولا	ہم پائیہ ہم پائیہ	ہتھار	پامی بھرننا
ہیہات	ہم پائیہ	ہتھ لینا	پانل ہول تاک
ہیئت	ہندستان	ہتھیلی	پاسے
ہیٹین	ہندو ہندوؤں	ہتھکولا	پاسے پاسے
ہیٹین	ہندو ہندوؤں	ہرج	ہتھ
ہیٹین	ہندو ہندوؤں	ہرجا	ہتھ
ہیٹین	ہندو ہندوؤں	ہرجانا	ہتھ